غالب اور بنگال

از

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

2/1,E اشوک نگر ۔ ریجنٹ پارک ۔ کلکتہ ۴۰

مصنف کی دیگر کتابیں

۱۔ راہ کا کانٹا

۲۔ شاعر کی شادی

۳۔ پختونستان کا مطالعہ

۴۔ بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات

۵۔ اردو کے ذریعہ بنگلہ سیکھو

۶۔ اردو اور بنگال

۷۔ مختصر تاریخ بنگلہ ادب (حصہ اوّل)

۸۔ " " " (حصہ دوم)

۹۔ آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو

۱۰۔ بکھرے ورق (ترجمہ)

۱۱۔ نامے جو میرے نام آئے

۱۲۔ تاریخ بنگلہ ادب (ترجمہ)

۱۳۔ بنگال میں اردو زبان وادب
چند مضامین

۱۴۔ پورن کمبھ (ترجمہ)

۱۵۔ آفتاب علم وادب ڈاکٹر چٹرجی

۱۶۔ غالب اور بنگال

کتب زیر طبع

۱۔ اردو ادب اور بنگالی کلچر

۲۔ خواتین بنگال کی اردو خدمات

۳۔ بنگال کے مسلمان

۴۔ تذکرہ تصانیف بنگالہ

اشاعت اوّل ______ نومبر ۱۹۷۷ء

تعداد ______ تین سو

قیمت ______ دس روپیہ

خوشنویس ______ رفیق اعلیٰ مظفرپوری

طابع ______ ہندستان آرٹ پریس

19/A ترہٹی بازار اسٹریٹ

کلکتہ - ۷۳

مصنف کا مکمل پتہ :-

ثنائی رنجن بھٹا چاریہ

2/1,E ____ اشوک نگر - ریجنٹ پارک

کلکتہ - ۷۰۰۰۴۰

فہرست

حرفِ اوّل

مرزا غالبؔ کی زندگی اور تخلیقات پر قلم اٹھانے والے ہر ادیب نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ مرزا کی زندگی، کلام اور شعور پر ان کے سفر کلکتہ کا نہایت گہرا اثر ہوا ہے۔ اس طویل سفر اور قیام کلکتہ نے غالبؔ کے دل و دماغ پر کئی ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو تاحیات مٹ نہ سکے۔ اس کے باوجود غالبیات میں ایسی کوئی کتاب آج تک منظر عام پر نہیں آئی ہے جو غالبؔ اور بنگال کے موضوع پر ہو۔ میری یہ مختصر تصنیف غالباً اس کمی کو دور کرنے میں کچھ مدد دے گی۔

میں نے ہر بات کو نہایت مختصر اور جامع طور پر کہنے کی کوشش کی ہے تاکہ بیکار صفحات کا اضافہ نہ ہونے پائے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو چار پانچ سو صفحات پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ لیکن غیر ضروری طور پر میں نے کہیں کوئی بات نہیں کہی ہے مثلاً غالبؔ بنگال کیوں آئے
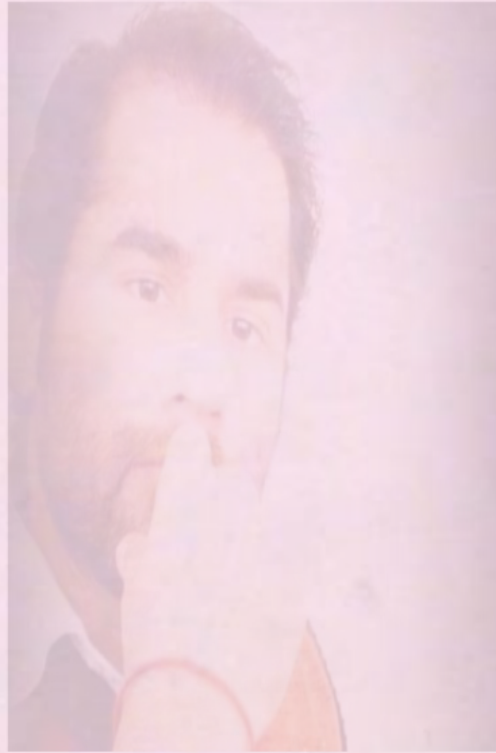
دہلی سے کلکتہ تک کا سفر، کلکتے میں غالب کا مقدمہ، مدرسہ عالیہ کا مشاعرہ ـــــــــ یہ سب ایسے باب ہیں جن پر دیگر چند تصانیف میں روشنی ڈالی جا چکی ہیں لہٰذا میں نے یہاں ان کو مختصر طور پر قلم بند کیا ہے۔

فقط

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

۲۶ر جون ۱۹۷۰ء

نوٹ:ـــــــــ

میں نے یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں لکھی تھی۔ لیکن گذشتہ چھ سال میں اسے چھپوانے کا کوئی انتظام نہیں کر سکا۔ جس کی وجہ سے اب یہ کتاب منظر عام پر آرہی ہے۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ

۱۵ر ستمبر ۱۹۷۷ء کلکتہ

غالب بنگال کیوں آئے؟
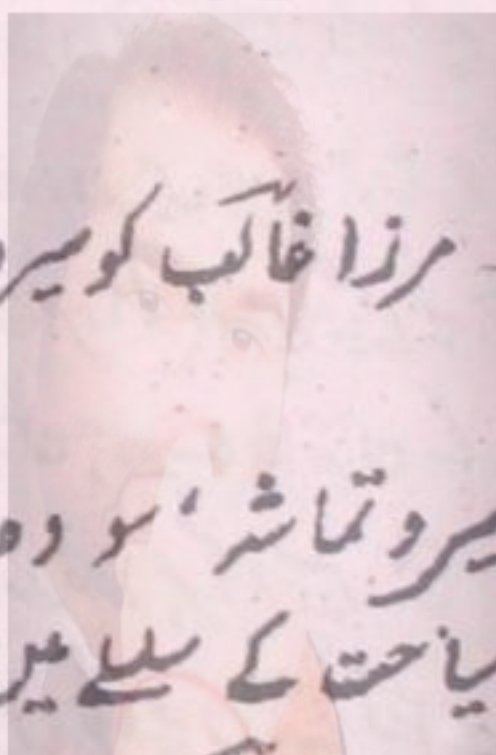
مرزا غالب کو سیر و تماشہ کی ہوس نہیں تھی وہ خود کہتے ہیں۔

"ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو"

سیاحت کے سلسلے میں غالب کی متضاد رائیں یہی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزا غالب ضرورتاً اور وہ بھی سخت ضرورت کے تحت ہی کسی سفر پر جانے کے لئے کمر باندھا کرتے تھے اور سفر بنگال تو ان کی زندگی کا سب سے طویل صبر آزما اور دشوار گذار سفر رہا ہے۔ اس سفر کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا حالی نے لکھا ہے [1]

---

[1] یادگار غالب - مولانا حالی

ؔ۔ کلکتہ جانے کا سبب یہ تھا کہ جب مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اس وقت مرزا کی عمر ۹ برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لئے جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے۔ جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محوّل کردی تھی۔ جب تک مرزا صغرسن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہونچے اور شادی ہو گئی۔ عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا۔ اور وہ بھی چند روز میں سب خرچ ہو گیا۔ لاچار فکر معاش دامنگیر ہوئی۔ اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور جھرکہ سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لئے گورنمنٹ سے مقرر کرائی تھی۔ اس قدر رقم ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا۔ ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہو گیا۔"

ایسی حالت میں جب مرزا اطراف سے پریشانیوں میں بری طرح پھنسے ہوئے تھے ان دنوں چند دوستوں کے مشورے پر وہ[۲] "فیروز پور جھرکہ گئے" تاکہ نواب سے پنشن میں اضافے کی درخواست کریں۔ ہ[۲]ان کا

---

[۲] غالب کا سفر کلکتہ۔ از سعادت علی صدیقی۔ رسالہ فروغ اردو لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

یہ سفر ناکام رہا۔ نواب نے اس طرف توجہ نہ دی۔" آخر کار غالب نے طے کیا کہ کلکتہ جا کر گورنر جنرل کے دربار میں وہ اپیل کریں گے اور اسی ارادے کے تحت وہ سفر کلکتہ پر روانہ ہو گئے۔

دہلی سے کلکتہ تک

—— غالب دہلی سے کب روانہ ہوئے اور کب کلکتہ پہونچے۔ کے سلسلے میں اختلافات ہیں۔ جناب مالک رام کے مطابق اگست ۱۸۲۶ء کے لگ بھگ غالب دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے۔ جناب گوپی چند نارنگ چاند پوری[۱] کے مطابق یہ سفر اپریل ۱۸۲۶ء سے شروع ہو کر نومبر ۱۸۲۹ء میں ختم ہوا۔ جناب پرتھوی چند رقمطراز ہیں[۲] —— "اپنا مرافعہ گورنر جنرل کے سامنے پیش کرنے کے لئے ۱۸۲۷ء میں (غالب) کلکتہ روانہ ہوئے۔" لیکن مالک رام کا سنہ یعنی ۱۸۲۶ء ہی کو زیادہ حضرات نے تسلیم کر لیا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ کیا غالب ۱۸۲۵ء میں نواب احمد بخش کی معیت میں بھرت پور کے لئے روانہ ہونے کے بعد پھر دہلی واپس لوٹے تھے یا فیروز پور، لکھنؤ، باندہ وغیرہ میں قیام کرتے ہوئے کلکتے کی طرف چل دیئے۔ جناب مالک رام فرماتے ہیں[۳] "—— کلیات نثر غالب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سفر پر روانہ ہوئے"

---

[۱] جہان غالب۔ از گوپی چند چاند پوری ص ۱ [۲] مرقع غالب۔ از پرتھوی چند ص ۲ [۳] ذکر غالب۔ از مالک رام

لیکن ڈاکٹر محمود الٰہی نے اسے غلط قرار دیتے ہوئے لکھا ہے[۱]۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ غالب، مولوی فضل حق خیرآبادی سے ملنے دہلی نہیں آئے۔ اب رہ گیا بھرت پور۔ کلکتہ والے سفر کے دوران فیروز پور سے دہلی کو واپسی کا سوال تو......... اس سوال کا خود غالب نے یہ جواب اپنی کلکتہ والی درخواست کے ذریعہ دیا ہے ــــــ لیکن قرض خواہوں کے شور و غل کے ڈر سے میرا (فیروز پور سے) دلی جانا ناممکن تھا۔ مجھے اپنی عزت کا خیال آیا اور آخر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا......... میں فیروز پور سے دلی جا نہیں سکا تھا۔ اب باندہ سے کیسے اور کیونکر اس کی جرات کر سکتا تھا۔"

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جب سنہ ۱۸۲۵ء میں غالب، نواب احمد بخش کی معیت میں بھرت پور گئے، تو اس کے بعد دہلی نہیں لوٹے۔ یعنی اس طویل سفر کا آغاز سنہ ۱۸۲۵ء ہی سے ہوا ہے۔

جب مرزا کان پور پہنچے تو ان کو وہاں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے چند روز رکنا پڑا۔ قیام کان پور کے دنوں ان کو خیال آیا کہ جب کان پور سے لکھنؤ صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہے تو لکھنؤ بھی دیکھ لیا جائے۔ لہٰذا صحت پاتے ہی لکھنؤ کی طرف چل دیئے اور یہ سفر انہوں نے پالکی کے ذریعہ طے کیا۔ تقریباً ۱۱ ماہ لکھنؤ میں رہنے کے بعد وہ ۲۶ ذی قعدہ بروز جمعہ سنہ ۱۲۴۲ھ لکھنؤ سے کان پور کے لئے واپس لوٹے اور دو شنبہ ۲۹ ذیقعدہ

۱۔ غالب کا سفر کلکتہ۔ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء

سنہ ۱۲۴۲ھ کو پھر سے کانپور پہنچ گئے۔ سنہ عیسوی کے حساب سے مرزا لکھنؤ
سے ۲۷ جون سنہ ۱۸۲۷ء کو روانہ ہوئے اور تیسرے دن یعنی ۳۰ جون سنہ ۱۸۲۷ء
کو وہ کانپور پہنچے اور وہاں تین دن رہے۔ پھر کانپور سے باندہ گئے۔
وہاں ان کے ماموں کے بیٹے اوزبگ جان مقیم تھے اور یہ ذوالفقار بہادر نواب
باندہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ باندہ میں غالب، اوزبک جان ہی
کے ساتھ رہے۔"

—— باندہ سے غالب موودہ (موودھا، موڑا یا مونڈا) پہنچے۔ جہاں انہوں
نے دو دن قیام کیا۔ محمد علی خاں کے نام ایک فارسی خط میں بھی غالب نے
لکھا ہے[2]۔ "پنجشنبہ کو موودھا پہونچا۔ دوشنبے کو روانہ ہوا۔ رات ایک گاؤں میں
گذاری۔ بروز سہ شنبہ در چلہ تارا رسیدہ۔" چلہ تارا تک کا یہ سفر انہوں
نے گھوڑا گاڑی سے طے کیا۔ وہاں سے کشتی کے ذریعہ الہ آباد پہونچے۔ غالب
اس سلسلے میں لکھتے ہیں[3]۔ "در چلہ تارا کا ماجرا دو عرضداشتوں میں لکھ چکا
ہوں۔ گھاٹ پر کشتی کرایہ لی اور نوکر اور گھوڑے کے ساتھ اس پر سوار ہوا"
الہ آباد میں غالب صرف ۲۴ گھنٹے رہے اور پھر وہاں سے بنارس کے لیے روانہ ہو گئے۔
الہ آباد سے بنارس کو روانگی کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے[4]۔ "دوسرے

۱۔ غالب کے فارسی خطوط۔ ایک نیا مجموعہ۔ از قاضی عبدالودود، ماہنامہ "ماہِ نو" کراچی فروری سنہ ۱۹۶۲ء
۲۔ مجموعہ دہلی اور غالب۔ از قاضی عبدالودود۔ سہ ماہی "اردو" کراچی۔ غالب نمبر سنہ ۱۹۶۹ء

دلی بس ملی اور وقت سحر ساحل گنگا پر پہونچا۔ دریا سے گزرا۔ اور بارے شوق سے سوئے بنارس گرم پویہ ہوا۔" "بنارس میں۔" پہلے سرائے نیرنگ آباد و مشہور بہ سرائے نورنگ آباد ٹھیرے۔ اس کے بعد اسی سرائے کے پیچھے حویلی مٹھائی و میاں رمضان میں جو ایک مبتذل سی جگہ تھی مقیم ہوئے۔" ایک اور خط میں بنارس میں اپنی قیام گاہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "میری اقامت گاہ ایک بڑھیا کا گھر ہے جو خود روغن چراغ کی محتاج ہے۔ اس کے پہلو میں کوئی ایسا مکان بھی نہیں کہ اس کے پتے سے خط منگاؤں۔ یہی ایک صورت ہے کہ آپ یہ لکھیں۔۔ محلہ نورنگ آباد، عقب سرائے نورنگ آباد، قریب حویلی گوری خانساماں، در حویلی مٹھائی و میاں رمضان، بمطالعہ اسد اللہ غریب الوطن تازہ وارد بنارس۔"

بنارس سے غالب کلکتہ کی طرف ہفتے کے دن روانہ ہوئے۔ چاند کی نویں یا دسویں تاریخ تھی۔ صحیح معلوم نہیں ہو سکا۔ غالب چاہتے تھے کہ بنارس سے بذریعہ کشتی وہ کلکتہ آئیں۔ لیکن اس سفر کے لئے ان کے پاس روپوں کی کمی تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عہد میں بھی گھوڑ سواری کا معقول انتظام یہاں نہیں تھا۔ اور بنارس سے کلکتہ آنے جانے کے لئے کوئی اچھا راستہ بھی نہیں تھا۔ بنارس جانے کے لئے ان دنوں گنگا کے کنارے کنارے، راج محل ہوتے ہوئے ایک سڑک چلی گئی تھی جس پر پالکی والے، سواری لے جایا کرتے تھے۔ پالکی کا کرایہ ان دنوں فی میل ایک روپیہ۔ دو آنے تک لیا جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں بھی کو

"بجرا" کہا جاتا تھا کے ذریعہ اکثر سرکاری ملازمین کلکتہ سے بنارس کے
درمیان سفر کیا کرتے تھے۔ خشکی کے راستے سے جانے میں وقت زیادہ لگتا تھا
اور راستہ بھی دشوار تھا۔ حالانکہ بنارس سے کلکتہ تک آنے میں جتنے ندی نالے
پڑتے تھے۔ ان تمام پر پل تھے۔ لیکن چور اور ڈاکوؤں کا خطرہ بھی تھا۔ سرکاری
ملازمین کو اس سفر کے لیے، جو وقت مقرر تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا
ہے۔ کہ کتنے دنوں میں ایک آدمی ان مقامات کا سفر کر سکتا تھا۔ سرکاری
ملازمین کو برہم پور سے کلکتہ آنے کے لیے ایک ماہ۔ بنارس سے کلکتہ آنے
کے لیے ڈھائی ماہ اور کان پور سے کلکتہ آنے کے لیے ساڑھے تین ماہ کا وقت
سرکاری طور پر منظور کیا جاتا تھا۔ غالب ۱۸۲۸ء کے اوائل میں کلکتہ آئے
ورنہ اگر وہ اس سال کے آخر میں کلکتہ آتے یعنی اگست یا ستمبر کے ماہ میں آتے
تو وہ بنارس سے کلکتہ کا سفر انجن والے بوٹ (کشتی) کے ذریعہ کر سکتے تھے
چونکہ ۱۸۲۸ء کے آخر تک ایسی سواری کا انتظام ہو چکا تھا۔ اور انجن والی
بوٹ کے ذریعہ کوئی ۱۲ دن میں بنارس سے کلکتہ پہنچا جا سکتا تھا۔ جبکہ
عام کشتیاں دو ماہ کا عرصہ لگا دیتی تھی۔ عام کشتیوں کے ذریعہ
دریائی سفر بھی ان دنوں خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سندربن
کے گھنے جنگلات کے علاقے میں ایسے خونخوار شیر تھے جو دریا میں تیرتے
ہوئے جا کر چھوٹی کشتیوں پر حملہ کر دیتے تھے۔ غالباً ان تمام دشواریوں
کو بھی غالب نے مدنظر رکھا تھا۔ لہٰذا انہوں نے کشتی کے سفر کا خیال
ترک کر دیا اور خشکی کے راستے گھوڑا گاڑی پر سوار ہو گئے

وہ بنارس سے عظیم آباد کے لئے کب روانہ ہوئے کا ذکر کرتے ہوئے محمد علی خان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"______ استنگل ۱۴ر شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا اور

وہاں سے کلکتہ پہونچا۔"

______ کس دن کلکتہ پہنچے، کا ذکر غالب نے نہیں کیا ہے۔ لیکن ۱۹ر فروری ۱۸۲۸ء کو زیادہ حضرات نے وہ دن تسلیم کر لیا ہے جس دن غالب کلکتہ آئے۔

کلکتہ میں غالب کا مقدمہ

______ یہ ضروری نہیں ہے کہ مقدمے کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے چند صفحات سیاہ کئے جائیں۔ چونکہ اس مقدمہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے نیز اس کا ذکر کئی تصانیف میں موجود ہے۔ خاندانی پنشن کے اس مقدمے کی تفصیلات کا ذکر جناب غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف "غالب" کے علاوہ ایک مضمون "غالب کی خاندانی پنشن" میں بھی کیا ہے۔؎۱

______ نواب احمد بخش کی زندگی ہی میں غالب کا خیال تھا کہ ان کو

؎۱ احوال غالب ۔ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد

پنشن کی رقم کم ملا کرتی ہے۔ لیکن نواب کی عنایات و توجہات کے پیش نظر غالب چاہتے ہوئے بھی زبان نہ ہلا سکے۔ لیکن نواب کے انتقال سے یہ کانٹا دور ہو گیا۔ جبکہ نواب احمد بخش کے فرزند نواب شمس الدین خاں وارث بنے۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ کی پنشن وارثوں پر باقاعدہ رسمی ۱۸۰۶ء والی قرار داد کے مطابق تقسیم ہو چکی تھی۔ جس کے بموجب غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف کو سات سو پچاس روپیہ فی کس ملتے تھے اس دستاویز پر ۷ رجون ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک نے تصدیقی دستخط کئے تھے۔ لیکن غالب کو اس تصدیق کا علم نہیں تھا۔ غالب کا خیال تھا کہ انہیں بہت کم روپیہ مل رہا ہے۔ اور ان کو سالانہ دس ہزار روپیہ ملنا چاہیے۔ لہٰذا غالب نے کلکتہ میں گورنر جنرل کے نام اپنی درخواست پیش کی تھی۔

غالب کے زمانے کا کلکتہ

کلکتہ ______ غالب کے دل کی گہرائیوں میں بس چکا تھا۔ وہ اس عظیم شہر کو تا حیات بھلا نہ سکے۔ بے شمار یادیں تھیں جو کلکتے سے وابستہ تھیں۔ تب ہی تو اس شہر کے ذکر سے وہ "ہائے ہائے" کر اٹھتے اور کہتے

_____ کلکتہ کو دیکھ کر غالب اتنے متاثر کیوں ہوئے تھے جب کہ ان کی زندگی بڑے بڑے شہروں میں گزری۔ وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اسی شہر میں گزرا۔ اور پھر شادی کے بعد وہ اس عہد کے دارالحکومت شہر دہلی میں بس گئے۔؟ _____ اس سوال کا مختصر جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ آگرہ اور دہلی کے دورِ زوال ہی کو غالب نے دیکھا تھا۔ اکبرآباد یا آگرہ کی گرتی ہوئی دیواریں اور کھنڈرات۔ اس کی گزشتہ عظمت کی گواہی دیتے اور کہتے کہ کبھی ان پر بھی بہار آئی تھی _____ دہلی۔ برائے نام ہی ان دنوں ہندستان کا پایۂ تخت تھا۔ اس تاریخی شہر کو نادر شاہ بری طرح لوٹ چکا تھا۔ مغل خاندان کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس بادشاہ کے سر پر صرف ہندستان کا تاج ہی رکھا ہوا تھا۔ ہندستان کی حکومت اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ دہلی کے در و دیوار پر سبزہ اُگ رہا تھا۔ اُن پر غربت کی گہری چھاپ تھی۔ شہر میں روزگار کے بہترے دروازے بند ہو چکے تھے۔ بس سب کچھ خول ہی خول تھا۔

_____ اور کلکتہ نئی تہذیب کا جلوہ گاہ، نئی تجارت کا مرکز، نئی حکومت کا نشان، نئی زندگی کا پیامبر اور شاندار مستقبل کا پاسبان تھا، اس کی رونق روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اُدھر دہلی کے قدیم مکانات گرتے جا رہے تھے اور ان کی جگہ نئے مکانات تعمیر نہیں ہو رہے تھے اور ادھر کلکتہ کے گھنے جنگلات کو کاٹ کاٹ کر اندھیرا دور کیا جا رہا تھا ایک طرف دہلی کی بستی ویران ہوتی جا رہی تھی۔ شاہ راہیں سنسان

ہو رہی تھیں۔ لوگ دہلی چھوڑ کر زندگی کی تلاش میں دور دور چلے جا رہے تھے تو دوسری طرف کلکتہ آباد ہو رہا تھا، بڑھ رہا تھا۔ نئے نئے راستے اور ان پر مختلف سواریوں کا ہجوم، نئے نئے لوگ دور دور سے نئی زندگی کی تلاش میں آ رہے تھے ۔ دہلی کی علمی اور ادبی محفلیں سونی ہو رہی تھیں تو کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج، ایشیاٹک سوسائٹی، مدرسہ عالیہ اور سنسکرت کالج کا قیام عمل میں آ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ہندستان کے کونے کونے سے علم و ادب کے متوالے اپنی قسمت آزمانے کلکتہ چلے آ رہے تھے۔ ہندستان پر نئے حاکم انگریزوں کا قدم جمتا جا رہا تھا اور کلکتہ اس نئے حاکم کا دارالخلافہ تھا۔

نئی زندگی سے فرار کیا کسی ذی شعور اور حساس طبیعت کے انسان سے ممکن ہے؟ غالب بھی متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ اگر ان کے بس کی بات ہوتی تو وہ اسی شہر کے دامن میں اپنی زندگی گذار دیتے۔ انھوں نے اس حقیقت کا انکشاف کلکتہ سے چلے جانے کے عرصہ بعد ایک خط میں مولوی سراج الدین احمد کو لکھتے ہوئے کیا۔

اگر میں عنفوان شباب میں وہاں (کلکتہ) گیا ہوتا۔ اور شادی و خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں، تو مدت العمر کے لئے کلکتہ ہی میں رہ جاتا

جناب احتشام حسین اور حمید احمد خاں[۱]

۱۔ غالب کا کلکتہ۔ پروفیسر احتشام حسین۔ رسالہ فروغ اردو "غالب نمبر" ۱۹۶۹ء

نے کلکتے کی عالیشان عمارتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کو دیکھ کر غالب متاثر ہوئے تھے۔ لہذا یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ وہ کون کون سی عمارتیں تھیں جن کو غالب نے دیکھا۔ اس سے غالب کے عہد کے کلکتہ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ذیل کی یہ چند مشہور عمارتیں ان دنوں بھی تھیں جب غالب کلکتہ میں تھے

مدرسہ عالیہ کلکتہ اسے عام طور پر آج کل کلکتہ مدرسہ کہتے ہیں۔ انگریزی عہد میں اسے مہامڈن مدرسہ بھی کہا جاتا تھا۔ ہندوستان میں عربی، فارسی اور اسلامی علوم کا یہ ایک اہم مرکز ہے اور اس لحاظ سے اس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ غالب نے نہ صرف اس مشہور مدرسہ کو دیکھا ہے بلکہ یہ مدرسہ ان کی زندگی میں ایک اہم باب کھولنے کا باعث بنا۔ یہ مدرسہ ۸۱-۱۷۸۰ء میں قائم ہوا۔ کلکتہ مدرسہ کی تاریخ پر اردو میں جو مضامین لکھے گئے ہیں ان میں اسے انگریزوں کی علم دوستی کا مظاہرہ قرار دیا گیا ہے یا پھر یہ لکھا گیا کہ چونکہ انگریز مسلمانوں کو خوش کرنا چاہتے تھے[1] لہذا انگریزی حکومت نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن کسی مضمون نگار نے یہ نہیں لکھا کہ آخر ہندوؤں نے اس کی ترقی میں کتنا ہاتھ بٹایا ہے۔ حالانکہ ہندو رئیسوں نے بھی اس کی تعمیر و ترقی کے لیے لاکھوں روپیہ چندہ دیا ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ مہاراجہ شبا کرشن دیب بہادر (کلکتہ) نے اس مدرسہ

---

[1] تواریخ کلکتہ۔ محمد عبداللہ سنہ ۱۹۳۰ء

کی تعمیر و ترقی کے لئے تین لاکھ روپے بطور عطیہ دیا ہے۔[1]

—— انگریزوں کے ابتدائی دور حکومت میں جب عدالتی زبان فارسی تھی ان دنوں اس مدرسہ سے عربی و فارسی میں جو طلبا اچھی طرح کامیاب ہو کر نکلتے تھے ان کو منصفی و قاضی عدالت یعنی ڈپٹی مجسٹریٹی کا عہدہ ملتا تھا۔ پہلے یہ مدرسہ بیٹھک خانہ کے پاس بہو بازار اسٹریٹ کے جنوبی کنارے ایک مکان میں تھا۔ لیکن کلکتہ مدرسہ کی موجودہ عالیشان عمارت (یعنی ۲۱ ویلسلی اسٹریٹ میں) کی تعمیر کا کام سنہ ۱۸۲۰ء میں شروع ہوا اور سنہ ۱۸۲۷ء میں یہ مدرسہ مکمل طور پر بن گیا۔ سنہ ۱۸۲۹ء سے اس مدرسہ میں انگریزی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ یعنی غالب نے ویلسلی اسٹریٹ کے موجودہ مدرسہ کو اپنے قیام کلکتہ کے زمانے میں دیکھا اور اسی عمارت کے ہال میں غالب کے اعزاز میں مشاعرہ بھی ہوا ہے۔

(۲) **گورنمنٹ ہاؤس:** کو بھی غالب نے کلکتہ میں دیکھا ہے۔ چونکہ یہ ڈلہوزی اسکوائر کی ایک عالیشان عمارت ہے اور غالب اس علاقے میں کئی بار گئے ہیں۔ غالب کے کئی خطوط میں دفتر فارسی لال دگھی اور ڈلہوزی کے تالاب کا ذکر موجود ہے۔

—— گورنمنٹ ہاؤس کی تعمیر کا کام سنہ ۱۷۹۹ء میں شروع ہوا تھا اور سنہ ۱۸۰۴ء

---

[1] کلکتہ پریچے (بنگلہ تاریخ کلکتہ) مرتب راما نند [illegible]

میں یہ مکمل ہوا۔ اس کی تعمیر پر اُس وقت ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ صرف ہوا تھا۔

۳ بنگال کلب یہ کلب ۱۸۲۷ء میں قائم ہوا جس کی عالیشان عمارت نمبر ۲۳ چورنگی روڈ پر تھی اور حال ہی میں جس قدیم عمارت کو توڑ دیا گیا ہے۔ کلکتہ میدان کے سبزہ زاروں کی سیر کرتے ہوئے اس پُروقار عمارت کو یقیناً غالب نے بار بار دیکھا ہوگا۔

۴ کسٹم ہاؤس کلکتہ کسٹم ہاؤس کو پہلے لوگ "حاصل دفتر خانہ" کہتے تھے۔ اس کی تعمیر کا کام جنوری ۱۸۱۹ء میں شروع ہوا تھا۔ اور اگست ۱۸۲۰ء سے قبل یہ کام پورا ہو گیا۔ عہد غالب میں گورنمنٹ ہاؤس کے بعد یہ دوسری بڑی عمارت رہی ہے۔

۵ منومنٹ ۱۹۶۹ء میں حکومت مغربی بنگال نے اس مینار کا نام "شہید مینار" رکھا ہے۔ جب غالب کلکتہ آئے تب بھی یہ مینار اسی طرح سربلند کھڑا تھا۔ اور اس کا نام "اکٹارلانی منومنٹ" تھا۔ چونکہ اسے اکٹارلانی کی یاد میں ۱۸۲۸ء میں قطب مینار دہلی کے نمونے پر تعمیر کیا گیا۔ اس کی تعمیر پر چالیس ہزار روپے صرف ہوئے اور اس کی بلندی ۱۶۵ فٹ ہے۔

۶ ٹاؤن ہال مغربی بنگال اسمبلی کے روبرو رومن طرز تعمیر پر موٹے موٹے ستون والے اس پُروقار عمارت کا نام ٹاؤن ہال ہے جسے غالب نے یقیناً دیکھا ہے۔ اس ٹاؤن ہال میں اس عہد کے تمام بڑے ادبی اور دیگر جلسے ہوا کرتے تھے۔ اس ہال کی سنہ تعمیر کے سلسلے میں اختلاف

ہیں۔ بعض نے سنہ ۱۸۰۶ء لکھا ہے اور بعض نے سنہ ۱۸۱۴ء۔ کلکتہ کے عوام نے سات لاکھ روپیہ خرچ کر کے اسے تعمیر کیا۔ یہ ہال ۱۹۲ فٹ لمبا ہے اور اس کی چوڑائی ۶۵ فٹ ہے۔

۷۔ **فورٹ ولیم**

قلعہ فورٹ ولیم تک تو غالب بار بار گئے ہوں گے۔ یہ پورا علاقہ پہلے گھنا جنگل تھا۔ جس کو کاٹ کر صاف کرنے کا کام جنوری سنہ ۱۷۵۸ء میں شروع ہوا اور یہ قلعہ سنہ ۱۷۷۳ء میں مکمل ہوا۔ پہلے اس قلعے میں چار ہزار آدمی رہنے کے لائق انتظام کیا گیا تھا۔ اور بعد میں ضرورت کے مطابق مزید اضافہ کیا گیا۔

۸۔ **قدیم امپیریل بینک**

یہ بینک ہندوستان میں پہلا انگریزی طرز کا بینک ہے جو یکم جون سنہ ۱۸۰۶ء میں قائم ہوا۔ پہلے اس کا نام "بینک آف کلکتہ" تھا اور یکم جنوری سنہ ۱۸۰۹ء کو اس کا نام بدل کر "بنگال بینک" رکھا گیا۔ اور پھر "امپیریل بینک"۔ ڈلہوزی اسکوائر کے علاقے کی آج بھی یہ ایک مایہ ناز عمارت ہے اور رائٹرس بلڈنگ جاتے ہوئے، غالب نے اسے کئی بار ضرور دیکھا ہو گا۔

۹۔ **ایشیاٹک سوسائٹی کا کتب خانہ**

۱۵ جنوری سنہ ۱۷۸۴ء کو یہ علمی، ادبی ادارہ قائم ہوا۔ اس کی پرانی عمارت جو آجکل نئی عمارت کے پیچھے کھڑی ہے۔ کا سن تعمیر سنہ ۱۸۰۶ء ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کتب خانے میں ۱۶ ہزار سنسکرت اور پانچ ہزار فارسی کی قلمی تصانیف محفوظ ہیں۔ یہی وہ سوسائٹی ہے جس سے

مولوی محمد علی مصنف "موید برہان" اور نواب عبداللطیف خان بہادر کا تعلق رہا ہے۔ دیوان غالب کے چند قدیم ایڈیشن اور "کلیات میر" کا پہلا ایڈیشن بھی اس کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

۱۰ **کلکتہ ٹکسال** اس عمارت کی تعمیر کا کام مارچ ۱۸۲۴ء میں شروع ہوا۔ اور ایک لاکھ ۶۰ ہزار پاؤنڈ کی لاگت پر یہ تعمیر ہوا۔ اس میں جو مشین بٹھائے گئے اُس پر دس ہزار پاؤنڈ مزید صرف ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے یہ دنیا بھر میں سب سے بڑا ٹکسال گھر ہے اور اگر غالب نے اسے دیکھا ہے تو انہوں نے اپنی زندگی میں دنیا کا سب سے بڑا ٹکسالی گھر دیکھ لیا تھا۔

۱۱ **رائٹرس بلڈنگ** اس عالیشان عمارت کی اپنی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ چونکہ اس نے کئی انقلابات دیکھے ہیں۔ اب یہ حکومت مغربی بنگال کا صدر دفتر ہے۔ یکم اپریل ۱۹۱۲ء تک اسی عمارت میں بیٹھ کر انگریزوں نے پورے ہندستان پر حکومت کی اور اس کے بعد دہلی کو ہندستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ غالب کے زمانے میں یہ انگریزی حکومت کا دفتر فارسی تھا۔ جہاں مترجمین رہا کرتے تھے اور جن کا کام فارسی درخواستوں کا انگریزی میں ترجمہ کرکے کونسل کے سامنے پیش کرنا تھا۔ غالب اپنی پنشن کی درخواست لئے یہاں گئے تھے اور چیف سکریٹری مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ اور مسٹر ہاٹن صاحب وغیرہ سے انہوں نے اسی جگہ ملاقات کی تھی۔ مسٹر اسٹرلنگ کی مدح میں غالب نے

جو قصیدہ کہا ہے اُس کو انہوں نے یہیں اُن کو سنایا بھی ہوگا ۔ رائٹرس بلڈنگ کی تعمیر کا کام سنہ ۱۷۸۰ء تا سنہ ۱۸۲۱ء میں مکمل ہوا یعنی وہ جسے قدیم وائٹرس بلڈنگ کہا جاتا ہے ۔ اس کے بعد بھی ہر عہد میں نئی نئی عمارتیں اس کے احاطے میں بنتی رہی ہیں ۔ لہٰذا قدیم وائٹرس بلڈنگ سنہ ۱۸۲۱ء میں بن چکا تھا ۔ اور غالب نے اسے اسی طرح دیکھا ہوگا جیسا کہ یہ اُنیسویں صدی کے ابتدائی دور میں رہا ہے ۔

۱۲ مسجد

غالب روزہ نماز کے کبھی پابند نہیں رہے اور جب غالب کلکتہ میں تھے ان دنوں وہ جوان تھے پھر بھی ہو سکتا ہے کہ مقدمے میں کامیابی کی دعا مانگنے کے لئے وہ کلکتہ میں کبھی نماز ادا کرنے کسی مسجد میں گئے ہوں ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نماز پڑھنے کلکتہ کی کس مسجد میں گئے ہوں گے ۔؟ آج کلکتہ اور اطراف کلکتہ میں کئی قابل دید مسجدیں ہیں ۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مسجد غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں نہیں تھی ۔ اُن دنوں کلکتہ کی یہ مشہور ناخدا مسجد تھی اور نہ دھرم تلہ اور ٹالی گنج کی مشہور ٹیپو سلطان مسجدیں ۔ لیکن جس جگہ آج عالیشان ناخدا مسجد کھڑی ہے ۔ قدیم کلکتہ کی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُسی مقام پر اس سے قبل ایک چھوٹی سی مسجد تھی ۔ جسے فوجداری بالاخانہ مسجد کہا جاتا تھا ۔ اس کے علاوہ کسی اور قدیم مسجد کا ذکر تاریخ کلکتہ میں نہیں ہے ۔ اس لئے اگر غالب نے کلکتہ کی کسی مسجد میں نماز ادا کی ہو تو وہ قدیم فوجداری بالاخانہ مسجد

ہی ہو سکتی ہے ۔

١٣ **بلویڈیا بلڈنگ** ۔ قدیم کلکتے کی یہ عالیشان عمارت ہے ۔ جس میں آج کل نیشنل لائبریری کلکتہ قائم ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ ١٧٦٠ء میں پرنس اعظم عثمان نے اسے بنوایا تھا ۔ کئی ہاتھ بدل بدل کر لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت میں رابرٹ پرنسپ سے حکومت نے اسے خرید لیا ۔

١٤ **کالی گھاٹ** کالی گھاٹ ۔ کالی دیوی کی مندر کے لئے مشہور ہے موجودہ مندر کی تعمیر ١٨٠٩ء میں ٣٠ ہزار روپیہ صرف کرنے پر ہوا ہے ۔ اس کی بلندی ٦٠ ہاتھ ہے ۔ ظاہر ہے غالب مندر دیکھنے نہیں گئے ۔ لیکن اس علاقے میں غالب آئے ضرور ہیں ۔ چونکہ یہیں ٹیپو سلطان گھرانہ (میسور فیملی) کے افراد کے مکانات تھے اور کالی گھاٹ کے علاقے میں موجودہ ٹرام ڈپو کے پیچھے آج بھی ٹیپو سلطان کے خاندان والوں کا بڑا قبرستان ہے ۔ جہاں اس خاندان کے افراد کی قدیم قبریں موجود ہیں اور ایک قدیم مسجد بھی ہے ۔ اور غالباً اب جتنی مسجد کلکتہ میں ہیں ۔ ان میں سب کا قدیم اسی شاہی قبرستان کی یہ مسجد ہے ۔ اسی قبرستان میں غالب کے شاگرد شہزادہ بشیر الدین کی قبر بھی ہے ۔

١٥ **سینٹ جارج گرجا گھر** یہ کلکتے کا قدیم گرجا ہے ۔ ایک لاکھ ستر ہزار روپیوں کی لاگت سے ١٧٨٧ء میں یہ تعمیر ہوا ۔

۱۶ **سنسکرت کالج** گول تالاب. جس کا ذکر غالب کے چند فارسی خطوط میں ہے. کے مشرقی کنارے یہ کالج ۱۸۲۴ء میں قائم ہوا۔ لہٰذا گول تالاب کے قریب سے گذرتے ہوئے غالب نے اس کالج کو بھی دیکھا تھا۔

۱۷ **راجہ رام موہن رائے کا مکان** جس زمانے میں غالب کلکتہ آئے ان دنوں راجہ رام موہن رائے کی شہرت کا ستارہ بلند تھا۔ اور ان کا مکان نمبر ۱۳۳، اپر سرکلر روڈ پر تھا جو مکان آج اسی علاقے کا پولیس اسٹیشن ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے غالب نے راجہ رام موہن رائے سے ملاقات نہیں کی۔ حالانکہ غالب ان کی ذات سے لاعلم نہیں تھے۔ لیکن غالب نے رام موہن رائے سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مرزا کے مخالفین میں سے مرزا افضل بیگ۔ جو شاہ دہلی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے ان دنوں راجہ رام موہن رائے کو بادشاہ دہلی کا سفیر بنا کر انگلستان روانہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور اس سلسلے میں مرزا افضل بیگ، رام موہن رائے سے اپنے تعلقات بڑھانے میں مصروف تھے۔ مرزا افضل بیگ جو خواجہ حاجی کے برادر نسبتی اور جائداد کے مقدمے میں مرزا غالب کے مخالف تھے۔ سے رام موہن کے تعلقات کی وجہ سے غالب کا خیال تھا کہ مرزا افضل بیگ نے غالب کے خلاف رام موہن رائے کے کان بھر دیے ہوں گے۔ لہٰذا غالب نے ان سے ملنا مفید خیال نہیں کیا۔ ایک فارسی خط میں رام موہن رائے کا ذکر کرتے ہوئے

غالب نے لکھا ہے[1] ـــــ

ـــ "از جملہ اخبارات وحشت انگیز یکے این است کہ بعض ثقات میگویند کہ جناب گورنر بہادر بر پوپٹ کونسلے قرار دادہ اند در رام موہن رائے یکے از اجزائے آں کونسل است اگر چنین است برحال خود م خوں باید گریست"

ـــــــ غالب نے رام موہن رائے سے ملاقات نہیں کی تب بھی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ مانک تلہ کے اس مکان کو غالب نے دیکھا ہوگا۔ چونکہ اس پورے علاقہ میں ان دنوں اس سے شاندار اور کوئی مکان نہیں تھا۔

ـــــــ جب غالب کلکتہ میں تھے ان دنوں کے بنگلہ اخبارات جو آج تک محفوظ ہیں۔ ان میں ہمیں شہر کلکتہ کے مختلف راستوں اور محلوں کے نام ملتے ہیں۔ مثلاً" باگ بازار ۔ جان بازار ۔ بڑا بازار ۔ باندی بازار ۔ بہو بازار ۔ دھرم تلہ بازار ۔ شملہ بازار ۔ جوڑاسا کو ال دیگھی ۔ گول دیگھی ۔ ہیسٹنگ اسٹریٹ ۔ کسائی ٹولہ ۔ ٹھیک خانہ ۔ خضر پور ۔ گارڈن ریچ ۔ ٹالی کھال ۔ کالی گھاٹ ۔ مولا علی باغ ۔ کیپنی باغ ۔ بنیت پور ۔ چورنگی ۔ اسپلانڈ ۔ اور فورٹ ولیم وغیرہ ـــــ غالب کے خطوط میں بھی ہمیں کلکتہ کے کئی راستے محلے اور بازاروں کے نام

ملے ہیں مثلاً چیت پور، شملہ بازار، اٹالی۔ لال دگھی اور برجو تالاب وغیرہ۔ ان مقامات میں سے صرف "شملہ بازار" کا ذکر "کلکتے میں غالب کا مکان" کے تحت کروں گا۔ چونکہ غالب شملہ بازار میں ٹھہرے تھے۔ دیگر مقامات کے لئے دو چار باتیں عرض کرتا ہوں۔

(۱) **چیت پور روڈ** کلکتے کے قدیم ترین راستوں میں سے ہے غالب نے اپنے خطوط میں "چیت پور" یا "چیت پور بازار" لکھا ہے۔ غالب کے زمانے میں چیت پور، مانک تلہ، تاجر ہاٹ، اور شالی کار کے تھانے ضلع چوبیس پرگنہ کے تحت تھے۔ کلکتہ کی ابتدا سے بہت پہلے بھی ہمیں چیت پور کا نام قدیم بنگلہ زبان کی تصانیف میں ملتا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ یہاں صدیوں پہلے بھی ایک بستی تھی۔ پندرہویں صدی عیسوی کا ایک بنگالی شاعر بپرداس نے اپنی تصنیف میں "منسار بھاشن" میں چیت پور اور کالی گھاٹ کا ذکر کیا ہے۔ عہد غالب میں نواب صولت جنگ ولد نواب محمد رضا خان، چیت پور کے نواب تھے۔
نواب صولت جنگ نہایت سخی اور رحم دل انسان تھے۔ آپ نے ۹ ستمبر ۱۸۳۳ء میں بمقام مرشد آباد انتقال فرمایا۔

(۲) **گول تالاب** اردو میں گول تالاب اور بنگلہ میں گول دگھی (دگھی یعنی تالاب) کہتے ہیں۔ ٹیل ڈنگہ کے علاقے میں یہ ایک نہایت قدیم تالاب ہے۔ غالباً یہ تالاب پہلے گول تھا۔ جس کی وجہ سے یہ نام پڑا ہے۔

(۲) اٹالی اٹالی کا ذکر غالب کے کئی فارسی خطوط میں ہے۔ غالب اٹالی کی مشہور درگاہ میں فاتحہ پڑھی تھی۔ اٹالی درگاہ میں فاتحہ پڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے:[1]

"———— ایک دوست نے رہنمائی کی اور دولت سرائے مخدومی مرحومی میں اٹالی گیا۔ پہلے مزار پر فاتحہ خوانی کیلئے حاضر ہوا۔"

———— اٹالی کو "انٹالی" بھی کہا جاتا ہے۔ بلکہ آجکل تو "انٹالی" ہی کہتے ہیں۔

(۳) برجو تالاب غالب کے ایک فارسی خط میں اس تالاب کا نام ملتا ہے مگر برجو تالاب ایک قدیم تالاب ہے اور اب بھی موجود ہے۔ یہ کلکتہ کلب اور سینٹ پال کیتھڈرل چرچ کے درمیان میدان کے علاقے میں ہے۔

(۴) لعل ڈگی غالب نے "لعل ڈگی" لکھا ہے۔ لیکن اس تالاب کا درست نام "لال دگھی" ہے۔ یہ تاریخی قدیم تالاب ڈلہوزی کا اسکوائر میں ہے۔ اور ڈلہوزی اسکوائر (آج کل جسے "بنئے بادل دنیش باغ کہا جاتا ہے) کے علاقے کا حسن اس تالاب کی وجہ سے قائم ہے۔ حالانکہ آج کل آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے اس تالاب اور باغ کا بہت بڑا حصہ گندہ ہو گیا ہے

---

[1] مجموعہ دہنی اور غالب اور قاضی عبدالودود خط نمبر ۲۰ رسالہ اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء
[2] مآخذ غالب " " " " " خط نمبر ۱۹

لیکن انگریزی عہد میں یہ علاقہ سیر و تفریح کے قابل تھا۔ اس تالاب کو "لال" کیوں کہا جاتا ہے۔ کے سلسلے میں کئی باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہولی کے دنوں یہاں کا مشہور مجو مدار زمیندار گھرانہ جن کا یہ تالاب تھا۔ اس تالاب کے باغ میں وہ رنگ رلیاں منایا کرتے تھے کہ ہولی کے رنگ سے پورے تالاب کا پانی لال ہو جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا نام لال تالاب یا لال دگھی پڑ گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ اس کے قریب رائٹرس بلڈنگ کی عالیشان لال عمارت گذشتہ دو صدیوں سے کھڑی ہے لہٰذا اس لال عمارت کی وجہ سے اس کا نام لال تالاب پڑ گیا ہے۔ غالب کے عہد میں یہ تالاب اور باغ نہایت ہی حسین باغ رہا ہو گا۔ چونکہ اُن دنوں یہ ایک تفریح گاہ تھا۔ اور یہ علاقہ اتنا آباد نہیں تھا۔ مرزا غالب دفتر فارسی میں (رائیٹرس بلڈنگ) اپنی درخواست پیش کرنے آئے تھے اور جب جب ان کو یہاں سے گذرنا پڑا ہے۔ ظاہر ہے انہوں نے یہ تالاب و حسین باغ کا لطف اٹھایا ہے ایک فارسی خط میں غالب نے اس تالاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ[1]

"مخدوم و مطاعِ من سلامت، امروز کہ برائے آب آوردن
به لعل ڈگی رفته، چوں صبح دم است۔

---

[1] مآثر غالب از قاضی عبدالودود خط نمبر ۲

تجارت، جہاز اور گیس لائٹ کی روشنی
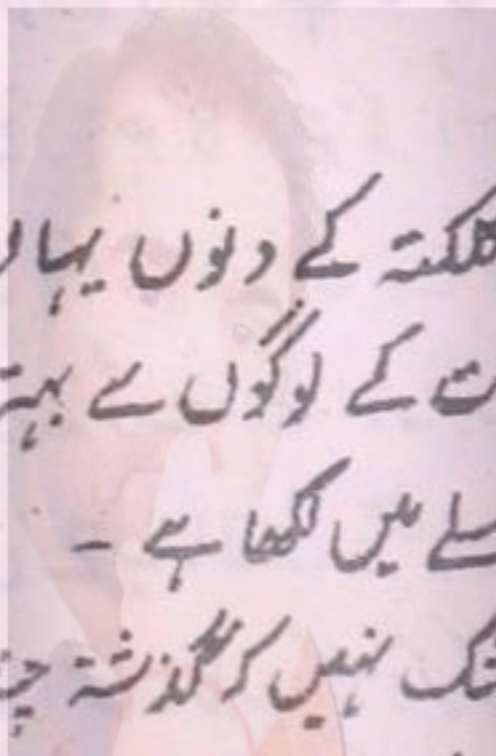
—— غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں یہاں کے باشندوں کی مالی حالت ہندستان کے دیگر مقامات کے لوگوں سے بہتر تھی۔ بنگلہ زبان کا اخبار "بنگ دوت"[1] نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ چند سالوں میں کلکتہ تیز پورے بنگال کی معاشی حالت پہلے سے بہتر ہو گئی ہے اور دولت سمیٹ کر اس دھرتی پر اتر آئی ہے۔ یہاں کی دولت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ زمین کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ دوسری یہ کہ اس ملک

---

[1] "بنگ دوت" کلکتہ مورخہ ۱۳ر جون سنہ ۱۸۲۹ء

میں آزادانہ طور پر تجارت نے ترقی کی ہے۔ خاص کر انگریز تاجروں کی آمد سے تجارت کو فروغ ہوا ہے۔ اب کلکتہ شہر میں کوڑیوں کا استعمال بالکل بند ہو چکا ہے۔ دس سال قبل اس شہر میں جو شخص مہینے میں دو روپیہ پاتا تھا۔ آج اسے چار پانچ روپے ملتے ہیں۔ پہلے جو ۸ روپے میں کام کرتا تھا۔ اب اسے ۱۶ تا ۲۰ روپے ملتے ہیں۔ محنت مزدوری پر اب پہلے سے بہت زیادہ روپے ملنے لگا ہے۔ پہلے ایک روپیہ میں بارہ کسان دن بھر مزدوری کرتے تھے اور اب ایک روپیہ میں چار سے زیادہ کسان ہرگز کام نہیں کرتے۔ اس طرح عوام کی حالت مجموعی طور پر بہتر ہوئی ہے اور تجارت نے خوب ترقی کی ہے۔"

—— تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی ترقی لازمی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ کے کلکتہ آتے آتے کئی اہم راستے بن چکے تھے مثلاً ۱۸۲۰ء میں چاندنی چوک سے باغ بازار کا راستہ اور دھرمتلہ سے بہو بازار کا راستہ بنا۔ ۱۸۲۳ء میں گنگا کے کنارے خضر پور ڈک سے گارڈن ریچ تک کا راستہ بنا۔ علی پور۔ خضر پور اور کالی گھاٹ سے ہو کر ٹالی گنج تک جانے کے لیے ۱۸۲۲ء میں "ٹالی نالے" پر پل بنا۔ فروغ تجارت کے ساتھ بینک وجود میں آئے۔ جب مرزا غالبؔ کلکتے میں تھے تب شہر کلکتہ میں جدید طرز کے کئی بینک تھے اور انشورنس (بیما) کمپنی بھی تھے مثلاً

(۱) مسر یرام پور بینک قائم شدہ سنہ ۱۸۱۹ء (۲) کمرشیل بینک، کلکتہ سنہ ۱۸۱۹ء (۳) کلکتہ بینک سنہ ۱۸۲۴ء (۴) کلکتہ ایکسچنج بینک سنہ ۱۸۲۹ء اور بینک ہندوستان کلکتہ سنہ ۱۸۲۹ء۔

—— غالب کلکتہ میں گنگا کنارے مختلف گھاٹوں پر گئے تھے جہاں انہوں نے جہاز دیکھے۔ اسٹیم سے چلنے والے یہ جہاز غالب کے لئے بالکل نئی چیز تھی اور اس عہد کے لوگوں کے لئے یہ ایک عجوبہ تھا۔ کلکتہ اُن دنوں بھی آج کی طرح ہندوستان کا سب سے بڑا بندر اور تجارتی مرکز تھا۔ جہاں دنیا کے کونے کونے سے جہاز آتے تھے۔ لہٰذا ان جہازوں کو دیکھ کر غالب کو متاثر ہونا ہی تھا۔ اور وہ ہوئے بھی۔ کلکتہ میں ان دنوں کتنے جہاز تھے یہ کہنا مشکل ہے لیکن اس کا ایک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اخبار "سماچار درپن" ۱۲ اگست [illegible]ء کے مطابق "کمپنی بہادر کے ہاں چینی جہاز ۲، ولایتی تجارتی جہاز ۱۵، انگلستان جانے کے لئے سواری کے جہاز ۴، چین جانے کے لئے سواری کے جہاز ۵، اور دیگر مقامات کے لئے ۲۹ جہاز ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر جہازوں کی تعداد ۴۳ ہیں۔ جن میں سے چند براستہ [illegible] اور چند کرائے پر دیئے جانے کے لئے ہیں۔ فرانسیسی جہاز دو۔ امریکن جہاز ۲، اور پرتگیز جہاز ۳ ہیں۔ اس طرح کل ۹۶ جہاز اب کلکتہ کی بندرگاہ پر موجود ہیں۔"

—— لیکن یہ تمام جہاز جن کا ذکر کیا گیا ہے بادبان اڑا کر چلنے والے جہاز تھے۔ پہلی بار کلکتہ کی بندرگاہ میں بھاپ کے انجن سے چلنے والے جہاز کب پہنچے کا ذکر بھی ہم اخبارات میں پاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ غالب کے کلکتہ

آنے سے قبل ہی انجن والے جہاز کلکتہ بندرگاہ پر آچکے تھے اور تجارت میں ان جہازوں کا استعمال ہونے لگا تھا۔ مذکورہ اخبار کے مورخہ ۱۰؍ دسمبر ۱۸۲۵ء کی ایک خبر میں کہا گیا ہے۔

"ہم نہایت مسرت سے یہ اطلاع دیتے ہیں کہ انگلستان سے بھاپ کے انجن سے چلنے والا جہاز کل کلکتہ کی بندرگاہ پر پہنچا ہے۔ اس جہاز نے تین ماہ اور ۲۲ دنوں میں انگلستان سے کلکتہ کا یہ سفر طے کیا ہے۔ لیکن یہ تو صرف پہلا سفر ہے۔ اِس لئے اتنے دن لگ گئے ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں کہ پہلے پہل کسی کام کو انجام دینے میں دیر ہوتی ہے لہٰذا امید کی جاتی ہے کہ آئندہ اور بھی بہت ہی کم عرصے میں یہ نئے انجن والے جہاز انگلستان سے کلکتہ تک کا سفر طے کرلیں گے۔"

مذکورہ خبریں گواہ ہیں کہ غالب نے کلکتے میں نہ صرف قدیم طرز کے بادبان والے جہاز دیکھے بلکہ انہوں نے انجن سے چلنے والے جہاز بھی دیکھے ہیں۔ شہر کلکتہ کی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۰؍ مئی ۱۸۲۳ء کے اخبار میں لکھا گیا ہے۔

"اس عظیم شہر کی آرائش کے لئے کئی شاہراہیں اور نالے بنائے گئے ہیں۔ شہر کے قدیم باشندے یہ خوب محسوس کرتے ہیں چونکہ یہ ترقی چند سالوں میں اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے اور کلکتہ کا حسن بڑھ گیا ہے۔"

پھر ۲۳ دسمبر ۱۸۲۶ء کو یہی اخبار لکھتا ہے۔

"۔ افسوس کہ چارنگ (وہ انگریز جسے کلکتہ شہر کا بانی کہا جاتا ہے) کا انتقال ہو گیا ہے۔ اگر آج چارنک ہوتا تو وہ یہ دیکھ کر پھولا نہ سماتا کہ اس کا قائم کیا ہوا یہ شہر کتنا ترقی کر چکا ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اس عظیم شہر کی رونق روز بروز بڑھے۔ صرف افسوس کی بات یہ ہے کہ پہلے زمانے میں دہلی اور قنوج جو نامی گرامی شہر تھے کی حالت رفتہ رفتہ بگڑتی جا رہی ہے۔"

کلکتہ کے راستوں پر عہد غالب میں بجلی کے قمقمے نہیں تھے۔ صرف چند اہم مقامات پر گیس کی روشنی تھی۔ اور غالب کے خطوط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے گیس کی روشنی کلکتہ میں دیکھی ہے۔ گیس کی روشنی کے سلسلے میں ۱۳ مارچ ۱۸۲۲ء کے اخبار میں لکھا گیا ہے۔

"۔ حال ہی میں سنا گیا ہے کہ بمقام دھرمتلہ کلکتہ میں ڈاکٹر ٹولمن صاحب نے اپنے کارخانہ میں ایسی گیس کی روشنی تیار کرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ جیسا کہ شہر لندن میں ہے اور وہ اپنے اس کارخانہ میں گیس کی روشنی تیار کر کے "لاٹری کمیٹی"[۱] کو کلکتہ کے راستوں کے لیے روشنی سپلائی (فراہم) کریں گے۔"

---

[۱] لاٹری کمیٹی۔ یہ کلکتہ کارپوریشن کی ابتدائی شکل ہے۔ لاٹری کمیٹی کے نام سے جو کمیٹی تھی وہی کارپوریشن قائم ہونے سے قبل اس شہر کی دیکھ بھال کرتی رہی ہے۔

غالب نے کلکتے کے یہ راستے - جہاز - کارخانے - بندرگاہ گھاٹ - باغات اور گیس کی روشنی کو دیکھا جس سے وہ بے حد متاثر ہوئے چونکہ یہ تمام چیزیں نئی تہذیب اور صنعتی انقلاب کے ابتدائی آثار تھے انہوں نے اپنے کلام اور خطوط میں ان چیزوں کا دل کھول کر سواگت کیا ہے - اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں صاحب لکھا

"نئی چیز کا قبول کرنا ، نئے خیالات کا خیر مقدم کرنا ترقی پسند ذہن کی علامت ہے - غالب اپنے ماحول (دہلی کا ماحول) سے غیر مطمئن تھے ہی اس لئے انہیں جب (کلکتہ میں) ایک زیادہ جاندار نظام نظر آیا تو اسے انہوں نے سراہا اور اس کا خیر مقدم کیا"

کلکتے میں غالب کا مکان

کلکتے کو THE CITY OF PALACES یعنی عالیشان

ملہ رسالہ فروغ اردو لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

عمارتوں کا شہر کہا گیا ہے اور عہد غالب میں یہاں جو قابل دید عمارتیں تھیں
کا مختصر ذکر پہلے صفحات میں کیا جا چکا ہے ۔ لیکن عام لوگوں کے لئے مکانات
کی اس عہد میں بھی کمی تھی ۔ اکثر اردو داں حضرات کا خیال ہے کہ کلکتہ میں
غالب کو ایک عالیشان مکان صرف دس روپے کرائے پر مل گیا ۔ جس خیال
کی بنیاد غالب کا ایک خط ہے جس میں انہوں نے کلکتہ والے مکان کو ہوادار
اور اچھا قرار دیا ہے ۔ اسی بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان دنوں
کلکتہ میں مکان کی قلت نہیں تھی اور نہایت کم کرائے پر بڑے بڑے مکانات
آسانی سے مل جایا کرتے تھے ۔ یہ خیال جو سراسر غلط ہے ۔ محض اس وجہ
سے ہے کہ ان کے سامنے اس عہد کے کلکتہ کا واضح نقشہ نہیں ہے ۔

ـــــ غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں کلکتہ کی آبادی کیا تھی درست
طور پر کہنا ممکن نہیں ہے چونکہ ان دنوں مردم شماری نہیں کی جاتی
تھی ۔ ۱۸۳۱ء یعنی غالب کے کلکتے سے چلے جانے کے تقریباً سال بھر بعد،
کی مردم شماری کے مطابق کلکتہ کی آبادی ۲ر۲۹ر۳۳۵ تھی ۔ اس آبادی
کے مقابلے میں کلکتہ میں مکانات کی بڑی کمی تھی ۔ ان دنوں کلکتہ میں
دو منزلہ عمارتیں برائے نام ہی تھیں ۔ متوسط طبقہ کے لوگ کچے " مکانات
میں رہتے تھے اور ان سے اوپری طبقہ کے لوگ ایک منزلہ مکانات میں گھر
کو سجانے کے لائق اسباب آرائش کی بڑی کمی تھی اور جو کچھ تھا وہ نہایت قیمتی
تھا ۔ اکثر انگلستان سے جو جہاز آتے ۔ اُن کے کپتان یا پھر ملک چین سے
آمدنی کرنے والوں سے آرائشی ساز و سامان نہایت اونچی قیمتیں ادا کر کے

خریدے جاتے تھے لہٰذا آرائشی ساز و سامان کا ہونا بھی ایک طرح کی عیاشی سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جن کے پاس اس طرح کا کوئی سامان ہوتا وہ اس پر فخر کرتے یا اسے اپنی عزت و وقار و مرتبہ امتیازی نشان سمجھتے تھے۔ مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں میں کہیں کانچ کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ کانچ کی جگہ بانس یا بید سے بنے ہوئے کھڑکیوں اور دروازوں کی جالیاں ہوتی تھیں۔ کانچ نہایت ہی قیمتی شے تھی اور جن کے مکان میں کانچ کا کوئی کام ہوتا۔ وہ رئیس کہلاتا قدیم کلکتہ کے مکانات کا ذکر پڑھنے پر ہم پاتے ہیں لارڈ وارن ہسٹنگز کے مکان کی کھڑکیوں میں کانچ لگے ہوئے تھے۔ رات میں گھروں کو چراغ کرنے کے لئے آج کی طرح بجلی کے قمقمے ہونا تو دور کی بات ہے۔ کراسن تیل کے ہریکین یا قندیل بھی نہیں تھے بلکہ عموماً انگریزوں یا رئیس ہندستانیوں کے مکانات میں ناریل کے تیل سے چراغاں ہوتا یا پھر موم بتی (شمع) کا استعمال ہوتا تھا۔ جس شمع کی لو کو باہر کی تیز ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے لمبی چمنیاں ہوتی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی میں ایک معمولی دو منزلہ مکان کا کرایہ زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ رہا ہے۔ جس سے قلت مکان کا مسئلہ سمجھ میں آجاتا ہے دو منزلہ پر ایک ہال اور دو چھوٹے کمروں والا ایک معمولی مکان کا کرایہ ایک سو پچاس روپیہ ہوگا ہوتا اور اگر ایسا کوئی مکان داس شہر میں ہو تو اس کا کرایہ کم از کم تین چار سو روپیہ ہوتا۔ وارن ہسٹنگس کے عہد حکومت میں کلکتہ میں مکانات کا کیا

حال تھا۔ کا کچھ اندازہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر انٹونی کی بیوی محترمہ فنی۔ نامی کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے انگلستان میں اپنے خاندان والوں کے نام لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

"اب یہاں کی (کلکتہ کی) روزمرہ زندگی اور میرے سنسار کے اخراجات کا حال لکھتی ہوں تاکہ کچھ اندازہ ہو جائے مکان کرایہ دو سو روپیہ ہے۔ چونکہ ہمارا مکان شہر کے کسی مرکزی مقام یا دامن شہر میں نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو پھر تین سو چار سو روپیہ کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ ہاں ہم بہتر مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔"

غالب سیر و تفریح کے لیے یا عیاشی کرنے کلکتہ نہیں آئے تھے ان کی مالی حالت ان دنوں بے حد کمزور تھی اور وہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کلکتہ آئے تھے۔ کلکتہ آتے آتے بھی انہوں نے کافی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ کلکتے ہی ان کو مقدمہ سنبھالنا تھا۔ اور اس عہد میں مقدمے کی فیس بہت زیادہ تھی۔ بچاسوں انگریزوں کو خوش کرنے کے بعد ہی ان کی درخواست پر غور کیا جا سکتا تھا۔ ان کاموں کے لیے غالب کو کافی روپیہ درکار تھا۔ کلکتہ میں ان کی غربت کا حال ان کے خطوط سے بخوبی چل جاتا ہے۔ مثلاً وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

۱؎ مجموعہ دہلی اور غالب از قاضی عبدالودود، خط نمبر ۱

"ـــــ تہی دستی کا حال یہ ہے کہ رمضان آگیا ہے اور توشہ ختم ہو گیا ہے۔ ...... روپے انعام، عملہ و خدمہ سکریٹری و گورنری میں صرف ہوئے۔ ہرچند کہ اس میں صرف بھی فراخ دستی و کشادہ دلی نہ تھی۔ چار پانچ ماہ کی اقامت کے لیے، اسی قدر کافی ہوگا۔ جو پہلے عنایت ہوا تھا۔ امید کہ آپ یہ رقم روانہ فرمائیں گے۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ ـــــ

"ـــــ حق یہ ہے کہ یہ روپے نہ آتے تو سخت مشکل کا سامنا ہوتا۔ گھوڑا ۱۵۰ میں بیچ دیا۔ ایک سائیس اور ایک خدمت گار کو برطرف کر دیا اور تین خدمتگار اور ایک کہار اس وقت میرے پاس ہے اور میں خود آدھا آدمی ہوں...

...... اسپ کے بعد پچاس روپے صرف میں آئے۔ سو روپے باقی بچے۔ فکر تھی کہ جاڑا آگیا۔ کمبل وغیرہ کی ضرورت ہے آپ کی دست گیری نے اضطرار سے رہائی دی۔ قیمت اسپ ساز و برگ سرما کی فراہمی اور ربیع الثانی کے چار ہفتوں تک کام آئے گی اور دو سو روپے رمضان تک وفا کریں گے اس لیے، کہ پچاس روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ کرنا طے کر لیا ہے۔"

مذکورہ خطوط سے ظاہر ہے کہ غالب کی مالی حالت

اُن دنوں نہایت کمزور تھی۔ ان کے ہاں دولت کہاں کہ وہ کلکتہ کے مرکزی علاقے یعنی ڈلہوزی اسکوائر۔ ایسپلانڈ، دھرمتلہ یا چورنگی کے کسی علاقہ میں کوئی مکان حاصل کرتے۔ لہٰذا انہوں نے مرکزی کلکتہ سے دور ہٹ کر ایک مزدوروں کی بستی میں یعنی موجودہ آزاد ہند باغ کے قریب مکان لیا۔ جو ڈلہوزی اسکوائر یعنی مرکزی شہر اور دفاتر کے علاقے سے کم و بیش ۲½ میل کے فاصلے پر ہے آج کے دور میں آزاد ہند باغ سے یا کسی اور مقام سے جو دو تین میل کے فاصلے پر ہو، ڈلہوزی یا دھرمتلہ آنا آسان ہے چونکہ سواری کے لئے ٹرام۔ بس۔ ٹیکسی وغیرہ کا انتظام ہے۔ لیکن غالب کے زمانے میں یہ کام آسان نہیں تھا۔ تب زیادہ تر لوگ پیدل سفر کرتے تھے اور رئیس اور دولت مند گھوڑا یا پالکی میں بیٹھ کر سفر کیا کرتے تھے غالب بھی ایک خط میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]۔ "

"_____ بازار شملہ شہر اور بارگاہ حکام سے دور ہے۔"

_____ کلکتہ میں مکان کا کرایہ زیادہ ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کلکتہ بنگال کے قدیم شہروں مثلاً ڈھاکہ یا مرشد آباد کی طرح کوئی پرانا شہر نہیں تھا کہ وہاں کرایہ پر دینے کے لئے کافی مکانات ہوں۔ کلکتہ تو ان دنوں صرف ایک زیر تعمیر شہر تھا۔ جہاں ہندستان کے کونے کونے سے لوگ آ آکر آباد ہوتے جا رہے تھے ایسی حالت میں

---

[1] مجموعہ دہلی اور غالب، از قاضی عبدالودود۔ غالب نمبر سہ ماہی اردو کراچی ۶۹

یہاں مکان کا ملنا مشکل ہی تھا۔ اور حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں تھی لہٰذا حکومت نے ایسا قانون بنایا تھا کہ کوئی مکان خالی نہ رکھنے پائے اور کرایہ پر اگر نہ بھی دے تو مکان کا ٹیکس ادا کرے۔ جس کی وجہ سے لوگ مکان خالی نہیں رکھا کرتے تھے چونکہ خالی مکان پر بے کار ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا اور اگر مکانات کرایے پر ہوں تو کرایہ دار سے مالکِ مکان ٹیکس وصول کر لیتے تھے۔

_____ مالک رام صاحب نے مرزا غالب کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"_____ کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ (انگریزی میں TOLA لکھا جاتا ہے۔ اس لیے مالک رام نے بھی ٹولہ لکھا ہے، درست تلفظ "تلہ" ہے، "تلہ" یعنی منزل یا مقام) اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک گرجا ہے۔ جس کا نام کرائسٹ چرچ ہے۔ اس گرجے کی پشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا جو مانک ٹولہ اسٹریٹ سے شروع ہو کر شمال کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی کا نام شملہ بازار تھا۔ یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصہ میں تو عمارتیں بن گئی ہیں۔ اور باقی میں بیتھون رو BETHONE ROW ہے۔ مرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اسی جگہ تھا۔ جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان نمبر ۱۳۲ ہے۔ اس کے

صحن کا کنواں ۱۹۳۰ء میں پاٹا گیا تھا۔"

——— غالب نے اپنے کئی خطوط میں احباب کو کلکتے کے مکان کا پتہ لکھا تھا۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں[1]

"——— شہر کلکتہ، قریب چیت بازار، در شملہ بازار نزدیک تالاب گرد، بمطالعہ اسد برسد۔"

——— رائے جھجل کے نام اپنا پتہ یوں لکھتے ہیں[2]

"——— در کلکتہ قریب چیت بازار۔ در شملہ بازار۔ نزدیک تالاب، در حویلی مرزا علی سوداگر بہ اسد اللہ برسد"

——— ایک اور خط میں لکھتے ہیں[3]

"——— آئندہ خط مولوی ولایت حسین کے توسط سے نہیں اس پتے پر بھیجیں۔ شملہ بازار، گول تالاب، حویلی میر احمد"

——— غالب کے مکان اور محلہ کا ذکر کرتے ہوئے، مولانا آزاد نے لکھا ہے۔"

"——— لارڈ امہرسٹ غالباً پہلے گورنر جنرل تھے جو شملہ گئے۔ اس وقت سے یہ رسم ہو گئی کہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال گورنر جنرل گرمیاں شملہ میں بسر کرے۔ اس زمانے میں ریل

۱۔ مجموعہ دہلی اور غالب از قاضی عبدالودود

۲۔ غالب۔ از غلام رسول مہر

۳۔ مجموعہ دہلی اور غالب۔ از قاضی عبدالودود

نہیں تھی۔ الہ آباد یا کانپور تک دریا کے ذریعے پھر پالکی، گاڑی اور گھوڑے پر، یہ سفر جس شاہانہ شان و شوکت اور ساز و سامان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس کی تفصیلات پوٹنجر HENERY POTINGER وغیرہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوئی ہیں۔ ایک پورا شہر کلکتہ سے شملہ تک اور پھر شملہ سے کلکتہ تک متحرک رہتا تھا۔ بہر حال اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں اور ملازموں کا ایک بڑا گروہ کلکتہ میں صرف اس سفر کے لیے رہنے لگا اور ان کے محلے کا نام شملہ بازار پڑ گیا۔ یہ چیت پور روڈ کے اس حصے میں تھا جو بعد کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے۔ اب یہ حصہ بالکل بدل گیا ہے پرانے مکانوں کے نام و نشان باقی نہیں۔ ریل کے جاری ہوتے ہی کیمپ کے متعلقات بھی معدوم ہو گئے تھے۔ اس لیے شملہ بازار بھی معدوم ہو گیا۔"

حالانکہ اب شملہ بازار کے نام سے کلکتہ میں کوئی بازار نہیں ہے لیکن اب بھی اس علاقے میں شملہ اسٹریٹ کے نام سے ایک راستہ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں کہیں شملہ بازار کبھی تھا اور آج بھی اس علاقے کے ایک ڈاک گھر کا نام شملہ بازار ڈاک گھر (کلکتہ ۶) ہے۔ شملہ بازار کب اجڑ گیا کے لیے کوئی تاریخ یا سنہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے

ریل کے جاری ہونے کے بعد یہ بستی اجڑ گئی۔ ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی ۱۸۴۵ء میں قائم ہوئی۔ لہذا اس کے بعد سے یہاں کا بازار اجڑنے لگا ہوگا اور مزدوروں کی بجائے نئے نئے پیشے کے لوگ یہاں آکر آباد ہوئے ہوں گے۔

_____ کلکتہ میں غالب کو جو مکان ملا۔ اس سے وہ واقعی خوش تھے۔ چونکہ غربت میں اس کی شکایت کیا کرتے اور پھر وہ کلکتہ میں آباد ہو جانے کے لیے تو آئے نہیں تھے کہ ایک عالیشان مکان کی ان کو ضرورت ہوتی۔ انہوں نے مولوی محمد علی خان صدر امین باندہ کے نام جو خط لکھا تھا اس میں اس مکان کی تعریف کی اور اس کا کرایہ "دہ روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ" لکھا ہے۔ اسی خط کی بنیاد پر مالک رام اور دیگر حضرات نے غالب کے اس مکان کا کرایہ دس روپیہ لکھا ہے ___ "پنج آہنگ" کے مذکورہ خط کے مطابق اس مکان کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ لیکن ایک اور خط میں کرایہ صرف چھ روپیہ درج کیا گیا ہے۔ اس سے یوں لگتا ہے کہ یا تو ان سے پہلے چھ روپیہ کرایہ لیا جاتا تھا اور بعد میں دس روپیہ لیا جانے لگا یا پھر ممکن ہے اسی شملہ بازار کے علاقے میں غالب نے اپنا مکان بدل دیا ہو۔ چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خط میں انہوں نے اپنے مکان کا پتہ "در حویلی مرزا علی سوداگر" لکھا ہے تو ایک اور خط میں "حویلی میر احمد" لکھا ہے حالانکہ محلہ وہی شملہ بازار ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے دوران ان کے خطوط مولوی ولایت حسین کے توسط سے آتے رہے ہیں جس کا ذکر مذکورہ خط میں کیا گیا ہے کہ جس خط میں

انہوں نے کرایہ چھ روپیہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں :۔

"_____ منگل ۴ شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا وہاں سے کلکتہ پہنچا۔ وہاں ایک اچھا مکان چھ روپیہ کرایہ کا مل گیا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے وہ جس مکان میں تھے اُس کا کرایہ چھ روپیہ اور یہی "میر احمد کی حویلی" تھی اس کے بعد وہ مرزا علی سوداگر کے مکان پر آئے جس کا کرایہ دس روپیہ رہا ہے۔

میوہ ہائے تازہ وشیریں
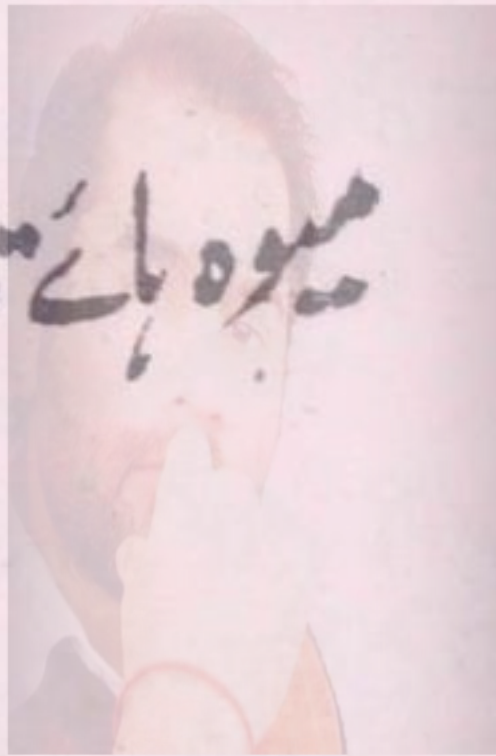
_____ آم سے غالب کو عشق تھا۔ مولانا خیر بہوردی (مرحوم) غالب اور آم کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :۔

۱؎ مجموعہ دہلی اور غالب سرماہی اردو "غالب نمبر کراچی ۱۹۶۹ء
۲؎ رسالہ فروغ اردو" لکھنؤ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

——— اُردو شاعری میں جس طرح سب سے پہلے سہرا غالبؔ نے لکھا اسی طرح آم کی تعریف بھی سب سے پہلے غالبؔ ہی نے لکھی ہے۔"

——— احتشام حسین مرحوم کے مطابق آم سے غالبؔ کا تعارف سب سے پہلے بنگال ہی میں ہوا تھا۔ آپ نے ادارۂ فروغ اردو ہند' لکھنؤ کی طرف سے دی گئی۔ آموں کی ایک پارٹی میں اپنے اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ۔

——— آم سے پہلے مرزا غالبؔ کا تعارف غالباً کلکتہ میں ہوا جہاں وہ تقریباً دو سال قیام پذیر رہے اور مرشد آباد کے آم ان کے کھانے میں آئے۔"

——— دیوان غالبؔ میں آم کی تعریف میں نہ صرف ایک مثنوی ہے بلکہ غالبؔ کے کئی خطوط میں آم کی تعریف۔ مختلف احباب سے آم کی فرمائش اور آم ملنے پر خوشی کا اظہار وغیرہ شامل ہیں، یہاں تک کہ غالبؔ اور آم کے سلسلہ میں کئی سچے جھوٹے لطیفے تک مشہور ہیں۔

——— ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیقؔ لکھتے ہیں:[1]

——— بعض اصحاب ذوق اور اہل علم احباب کو تو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ غالبؔ نے سفر کلکتہ محض آموں ہی کے شوق میں

۱۔ دیکھیے رسالہ "فروغ اُردو"، لکھنؤ فروری سنہ ۱۹۷۰ء

کیا تھا۔ پنشن کے مقدمے کا تو محض ایک بہانہ تھا خدا بہتر جانتا ہے
کہ یہ خیال آرائیاں اور بدگمانیاں کہاں تک صحیح ہیں۔"

———— بہرحال یہ ایک بدگمانی ہی ہے۔ چونکہ غالب جیسے شخص
کے لیے دہلی سے کلکتہ تک محض آم کھانے کے شوق میں چلے آنا، اور وہ بھی
آج سے کوئی ۱۵۰ سال پہلے، کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ لیکن یہ خیال آرائیاں
پر روشنی ڈالتی ہیں کہ غالب آم کے [illegible] منگواتے تھے۔ اہل علم اس حقیقت سے
بخوبی آگاہ ہیں کہ غالب کو بنگال کے آم بے حد پسند آئے تھے اور انہوں نے
خوب خوب آم کھائے اور دل کھول کر انبۂ بنگالہ کی تعریف کی۔

گر میوۂ فردوس بعنوانت باشد
غالب آن انبۂ بنگالہ فراموش مباد

———— کلکتہ میں غالب کوئی ڈیڑھ سال تھے۔ غالب کے خطوط
سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں ان کو آم کھلانے والے بھی ملتے ہیں اور یہاں سے
ان کو آم بھیجنے والے بھی ملے ہیں۔ ہگلی کے آم کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے
امام باڑہ ہگلی کے متولی کے نام ایک خط میں لکھا ہے[1]

———— لختے شکم بندہ ام۔ و قدرے ناتواں۔ ہم آرائش خوب
جویم، و ہم آسائش جاں، فرد دوراں داند کہ ایں ہر دو صفت
بہ انبہ اندر است۔ اہل کلکتہ برآنند کہ قلمرو انبہ ہگلی جندر بہت

آرے ۔ انبہ ' از ہگلی و گل از گلشن ۔"

——— مولوی سراج الدین احمد کے نام کلکتے سے واپس لوٹ جانے کے بعد ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں ۔

——— ہائے سرد و خوشا آب ہائے گوارا و ما بادہ ہائے ناب و فرا شرہائے شیریں ۔"

——— بنگال میں آم کا موسم اپریل سے شروع ہوتا ہے اور جون ، جولائی تک یہاں آم خوب ملتے ہیں ۔ اس لحاظ سے غالب کو بنگال میں خوب آم کھانے کو ملا ہے چونکہ وہ ماہ فروری میں کلکتہ پہنچ چکے تھے اور دوسرے سال بھی آم کے موسم میں وہ کلکتہ ہی میں مقیم تھے ۔ یعنی دو سال وہ آم کے موسم میں کلکتے میں رہے ہیں ۔

——— بنگال کے آموں میں مرشد آباد ۔ سلہٹ ۔ مالدہ ۔ ہگلی اور ٹالی گنج کے آم مشہور ہیں ۔ غالب مرشد آباد میں نہیں ٹھہرے اور جیسا کہ بعض بعض نے لکھا ہے کہ وہ مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتہ آئے تھے ۔ اگر اس کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی مرشد آباد میں ان دنوں آم کا موسم نہیں تھا ۔ لہذا کلکتہ پہونچنے کے کوئی دو ماہ بعد ہی غالب کو آم کھانا میسر ہوا ۔ ہاں مرشد آباد کے آم کھانے کے لئے اُس عہد میں بھی کسی کو مرشد آباد تک یا وہاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی ۔ چونکہ کلکتہ کے بازار میں مرشد آباد کے آم بکثرت ان دنوں بھی آتے تھے ۔ ہم جانتے ہیں کہ غالب کے تعلقات ٹالی گنج (کلکتہ) کے ٹیپو سلطان گھرانے

جو آم ہوتا تھا۔ ان میں "گلاب خاص" نامی ایک لذیذ آم نہایت مشہور
رہا ہے۔ آج بھی بنگال کے آموں میں "گلاب خاص" کو ایک مرتبہ حاصل
ہے۔ لیکن اب یہ آم بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ چونکہ شمالی گنج کے وہ باغات
آج کل نہیں ہیں۔ مالدہ نامی مالدہ ضلع کے مشہور آم غالب نے خوب
کھائے ہیں۔ یہ بنگال کا مشہور آم ہے۔ جو ضلع مالدہ مغربی بنگال میں آج
بھی بہ کثرت ہوتا ہے۔ غالب نے ایک خط میں اس آم کا ذکر کرتے
ہوئے لکھا ہے۔

"آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ انگور سے کم عزیز نہیں
لیکن بمبئی اور سورت سے یہاں پہونچنے کی کیا صورت؟ مالدہ
کا آم یہاں پیوندی اور ولایتی کر کے مشہور ہے۔ اچھا
ہوتا ہے۔" (۱)

اس خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مالدہ نامی آم
بنگال کے ضلع مالدہ میں مشہور رہے ہیں بلکہ بمبئی اور صورت میں بھی یہ آم
بہت عزیز سمجھے جاتے تھے۔ آج کل تو یہ آم غیر ممالک کو بھی برآمد کیا جاتا ہے۔

بنگالی کے آم کا ذکر بھی غالب نے کئی خطوط میں کیا ہے۔
مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں (۲)

---

(۱) اردوئے معلی۔ خط بنام منشی میاں داد خان سیاح

(۲) مجموعہ دہلی اور غالب از قاضی عبد الودود

"______ نواب علی اکبر خان بہادر کشاکش حکام سے فارغ ہیں اور اغلب و اکثر آم بھیجتے رہتے ہیں۔"

______ عہد اورنگ زیب کے مشہور غیر ملکی سیاح جنہوں نے ۱۶۶۶ء میں ہندستان کا سفر کیا تھا، بنگال کا ذکر کرتے ہوئے یہاں کے پھلوں کے سلسلے میں اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے۔

"______ بنگال کی سرزمین پھلوں کے لئے نہایت زرخیز ہے۔ یہاں آم۔ جام۔ کٹھل۔ لیچو، ناریل، سپاری وغیرہ خوب ہوتے ہیں اور بہتر ہوتے ہیں۔ مرشد آباد۔ مالدہ۔ ہگلی۔ دیناجپور اور ۲۴ پرگنہ کے اضلاع میں خوش ذائقہ اور مختلف اقسام کے آم ہوتے ہیں۔ جو بہت مشہور ہیں۔ کیلے۔ پپیئی۔ جامن اور کٹھل بھی یہاں کے مشہور ہیں۔"

______ مرزا غالب نے بھی یہاں کے میوہ کی تعریف کی ہے۔

یہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ

______ ان تازہ و شیریں میوہ میں کیا کیا شامل ہیں کا ہمیں درست علم نہیں ہے۔ آم کے علاوہ صرف ڈاب یعنی کچا ناریل کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ بنگال کے لوگ یوں تو ہر موسم میں ڈاب کا استعمال کرتے ہیں لیکن خاص کر موسم گرما میں اس کا استعمال بہت ہوتا ہے۔ غالب نے اپنی زندگی میں پہلی بار سرزمین بنگال میں ڈاب کا میٹھا میٹھا پانی پیا ہے۔ یہ بات اس لئے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ڈاب کا پانی دہلی۔ آگرہ لکھنؤ یا

ان دیگر مقامات میں جہاں جہاں غالب گئے تھے میں استعمال کا رواج نہیں رہا ہے۔ کم از کم غالب کے زمانے میں ان علاقوں میں ڈاب نہیں بکتے تھے صرف جنوبی ہند (مالابار، کوچین اور مدراس) کے علاقوں میں عہد قدیم سے ڈاب کا استعمال ہوتا آیا ہے۔ اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ غالب نے جنوبی ہند کا سفر نہیں کیا ہے۔ ڈاب کا پانی استعمال کرنے والا واحد ملک بنگال ہی ہے جہاں غالب آئے تھے اور انہوں نے ڈاب کا میٹھا پانی پینے کے لیے لکھا۔

"________ شدت گرما میں ناریل کا تازہ پانی باضافہ قند و نبات مفید ثابت ہوا۔ آج کل برسات کا موسم ہے۔ میں نے اس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔"

بادہ ہائے ناب گوارا۔!

________ غالب نے ابتدائی زندگی کے چند سال خنجایت علیہ آرام میں گزاری ہے۔ ان کو ماحول ہی ایسا ملا تھا کہ شراب ان کی زندگی کا جز

بن گئی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ "عادت" اک دن رنگ لائے گی" وہ اس بُری عادت سے مرتے دم تک چھٹکارا نہیں پا سکے۔ غالب نے شراب کے سلسلے میں کئی اشعار کہے ہیں۔ ان کے خطوط میں بھی مختلف شراب اور مے نوشی کا تذکرہ جگہ جگہ ہے۔

قیام کلکتہ کے دنوں انہوں نے انگریزی سماج کو بڑے غور سے دیکھا اور اس سماج میں ملنے کی کوشش کی۔ ان دنوں "بتانِ لندن" کے عشق میں بھی وہ سرگرم رہے ہیں۔ "بتان لندن" جو شراب پینے میں مردوں کے دوش بدوش تھیں۔ اس دور کے انگریز (اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے۔ نقال ہندستانی رئیس بھی) یہ خیال کرتے تھے کہ ہندستان کی آب و ہوا میں شراب پینا صحت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے عموماً وہ کھلے عام شراب پیتے۔ کلکتے میں ابتدائی دور کا انگریزی سماج کی تاریخ سے یہ باتیں واضح ہو جاتی ہیں اور ہم ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں میں سے اکثر کا کردار اخلاقی معیار سے بہت گرا ہوا تھا۔ ہری ہر سیٹھ نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔ (۱)

"ان دنوں حد سے زیادہ شراب پی جاتی تھی اور یہ نہایت عام مشروب تھا۔ اکثر انگریز اور ہندستانی رئیس روزانہ ۳/۴ بوتل شراب کی پی لیتے اور یورپین

---

(۱) کلکتہ پریچے۔ (بنگلہ تصنیف) از ہری ہر سیٹھ

خواتین کم از کم ایک بوتل شراب پی لیتی تھیں*۔ "کلاریٹ" اور "مدیرا" محبوب شراب تھے۔ "بیئر" اور "پورٹار بیئر" کی اہمیت نہیں تھی۔ "سٹراد" اور "پیری" جو بہ ترتیب سیب اور جامن سے تیار ہوتے تھے بھی پسند کیے جاتے تھے۔ خرید گرمی میں بیشتر حضرات "آراک" نامی شراب پیتے۔ انگریزی "کلاریٹ" ایک درجن بوتلوں کی قیمت ساٹھ روپے تھی۔"

——— بنگال میں مختلف شراب کی تعریف کئی یورپی اہل قلم نے کی ہے۔ جن سے اس عہد میں یہاں کے شراب پر روشنی پڑتی ہے مثلاً "محترمہ فے۔ نامی (بیرسٹر مسٹر انتھونی کی بیوی) کے ایک خط میں اس عہد کے مختلف اشیا کی قیمتوں کا ذکر ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

——— مدیرا شراب کی قیمت بہت زیادہ ہے لیکن دیگر اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں کم ہیں۔ انگلش کلاریٹ شراب اب ساٹھ روپیہ فی درجن بوتل کے بھاؤ سے بک رہا ہے۔"

——— عہد اورنگ زیب کا سفیر فرانسو یا بارنیر نے لکھا ہے۔

——— ایک دیسی شراب جو گڑ سے تیار ہوتی ہے کو بنگال کے لوگ "بولے پنچ*" کہتے ہیں اور اسے اکثر نیبو کا رس ملا کر پیا جاتا ہے۔ یہ خوش ذائقہ ہے اور عام طور پر

* لفظ "بوتل پنچ" دو الفاظ "بوتل" اور "پنچ" کا امتزاج ہے "بوتل" کے معنی پیالہ یا جام ہے اور "پنچ" یعنی وہ مسالے جو شراب میں ملائے جاتے ہیں۔ [illegible]

پسندیدہ بھی۔"

—— پارکر (H. MEREDITH PARKER) نے "بولے پنج" کو (BOLE - PONJi) "بولی پنجی" لکھا ہے۔ ان کی تصنیف ۱۸۵۲ء میں چھپی مسٹر ابھنگ ٹن (OVINGTON) نے اپنی کتاب میں بنگال کے شراب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ۔[۱]

" —— حالانکہ انگریز لوگ گوا اور بنگال دونوں مقامات کے شراب کا خوب استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بنگال کی شراب گوا کی شراب سے زیادہ خوش ذائقہ اور تیز ہوتی ہے ۔"

—— غالب کے کئی خطوط ایسے ہیں جن میں انہوں نے کھل کر انگریزی شراب سے اپنے عشق کا ذکر کیا ہے ۔ اس لئے یہ خیال کرنا زیادتی نہیں ہے کہ غالب نے اس عہد کے مذکورہ تمام شراب جو بنگال میں مقبول تھے گا ذائقہ ضرور چکھا ہوگا ۔ " وسکی " اور " اولڈ ٹام " کے علاوہ انہوں نے کئی دیگر شراب پئے ہیں ۔ ان کے خطوط میں چند شراب کے نام بھی آتے ہیں ۔ میر مہدی کے نام لکھتے ہیں ۔[۲]

" —— لکورا ایک انگریزی شراب ہوتی ہے قوام کی بہت لطیف اور رنگت کی بہت خوب اور طعم کی ایسی میٹھی

۱؎

۲؎ عود ہندی ۔ خط نمبر ۶۶

جیسا قند کا قوام ہے۔"

——— کلکتے کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے بنگال کے "بادہ" کو "ناب" یعنی خالص و عمدہ قرار دیا ہے اور اس کے ذائقے کو "گوارا" یعنی پسندیدہ، خوش ذائقہ، ایسا من بھاتا کہا ہے کہ ان کا دل اس کے لئے ایک عرصے بعد بھی "ہائے ہائے" کرتا رہا ہے۔

نازنینِ بتانِ خود آرا!
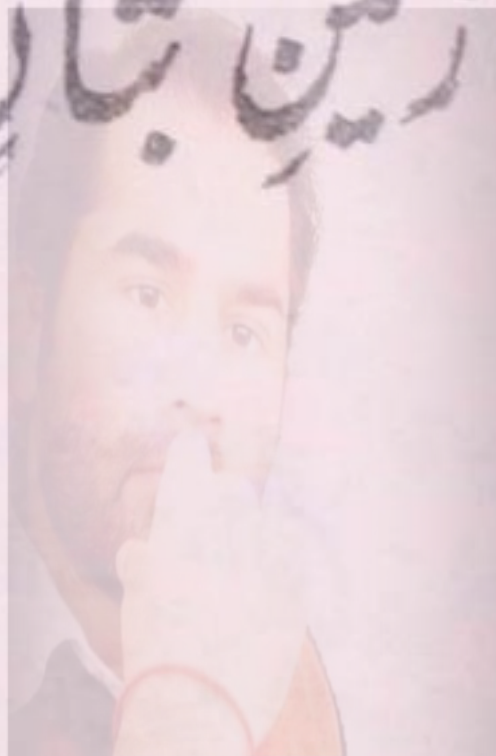
——— جب مرزا کلکتہ آئے تب اُن کی عمر ۳۰۔ ۳۱ سال کی تھی یعنی بھرپور جوانی کا عالم تھا۔ وہ حُسن پرستی کا اعلیٰ مذاق رکھتے تھے اور عشق کے معاملے میں بھیگی بلی نہیں بلکہ کامل مرد تھے۔ دل پھینک اور

نظر باز بھی تھے۔ لیکن غالب نے کلکتہ میں ان کے عشق و محبت کا کوئی قصہ بیان نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود کلکتہ سے چلے جانے کے عرصے بعد بھی بلکہ تاحیات وہ یہاں کی "نازنین" کو فراموش نہیں کر سکے۔ "کلکتہ کا جو ذکر ہوتا تو ان کے سینے میں "اک تیر" آلگتا" جو جگر کے پار ہو جاتا۔ انہیں وہ دن رات یاد آجاتے جب وہ "بتان سیم تن" کے درمیان تھے ان کی نظروں میں ان "نازنین" کی "صبر آزما نگاہیں" ابھرتیں۔ ان کے "طاقت رُبا اشارے" یاد آتے اور غالب "ہائے ہائے" کرکے رہ جاتے ہیں بس یہی وہ باتیں ہیں جن سے نکلتے ہیں ان کی عشق و محبت کی داستان سمجھی جاسکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ "نازنین" کون تھیں؟ کون سی "نگاہیں" اور کن کن کے "اشارے" ان کو "ہائے ہائے" کرنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ "نازنین" بنگالن تھیں؟ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ "نازنین" بنگالن نہیں تھیں۔ غالب نے کسی بنگالی حسینہ کو قریب سے نہیں دیکھا۔ حیاتِ غالب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کلکتہ آنے کے باوجود وہ خالص بنگالی سماج سے بہت دور رہے ہیں۔ ان کے ملنے والوں اور دوست احباب میں خاص بنگالی شامل نہیں تھے۔ کلکتہ میں ان کا قیام شملہ بازار میں رہا ہے۔ جو بنگالیوں کا محلہ نہیں بلکہ اس عہد میں ایک مزدور کالونی

اور یو پی سے کلکتہ میں روزگار کے لئے آئے ہوئے مزدوروں کا تھا
صرف محلہ کا سوال نہیں۔ خطوط غالب سے بھی واضح ہوتا ہے کہ
ان کا تعلق کلکتہ میں کسی بنگالی سے نہیں رہا ہے۔ آج تک جتنے
فارسی و اردو خطوط غالب منظر عام پر آئے ہیں ان میں کسی بنگالی
کے نام ان کا کوئی خط نہیں ہے۔ ناسخ کے نام دو خط ہیں۔ لیکن
ناسخ سے غالب کا تعلق بڑھاپے میں ہوا جب وہ دہلی میں تھے)
کلکتے میں غالب کے ملاقاتیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا
ہے کہ:

> ——— جس زمانے میں مرزا غالب کلکتہ آئے
> یہ یہاں کے ایرانی تاجروں کے کمال عروج کا زمانہ تھا
> فوجداری بالاخانہ، آرمینین اسٹریٹ اور سندر پاٹی (سنڈیبیگی)
> میں بڑی بڑی کوٹھیاں تمام ان کی تھیں اور شہر کی اعلیٰ
> سوسائٹی میں نہایت معزز و محترمانہ سمجھے جاتے تھے۔ ناسخ
> لکھتے ہیں کہ کلکتے میں مرزا غالب کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں
> سے رہا۔[۱]

——— جب غالب نے اس شہر کے کسی بھی نامور
بنگالی رئیس، شعراء، راجے وغیرہ جن کا سماج میں مقام تھا

۱؎ غالب اور ابوالکلام - مرتبہ عتیق صدیقی۔

مرتبہ تھا، عزت تھی، حکومت وقت میں جن کی آواز تھی، میں سے
کسی سے ملاقات نہیں کی تو پھر یہ کیوں کر باور کیا جاسکتا ہے کہ
انہوں نے کسی بنگالن سے عشق لڑائی ہوگی۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے
کہ غالب بنگلہ زبان سے ناآشنا تھے اور آج کی طرح اس عہد کی
بنگالن شاہراہوں پر نظر نہیں آتی تھیں۔ اُس سماج میں تعلیم نسواں
عام نہیں تھا اور نہ ہی عورتیں دفاتر میں کام کرتی تھیں۔ ایسی حالت
میں جبکہ وہ صرف گھر کی دیویاں تھیں کسی اجنبی کے لئے یہ ممکن نہیں
تھا کہ وہ بنگالن سے عشق لڑائے صرف آشنا ہو سکتا ہے غالب نے چند
بنگالن ادھیڑ عمر کی عورتوں کو گنگا کے گھاٹ پر اشنان کرتے دیکھا ہو
گنگا کے گھاٹ پر بھی عورتوں کے نہانے کے مقامات الگ تھے اور
پردے کا انتظام تھا۔ اس عہد میں ہندو عورتیں بھی پردہ کرتی
تھیں اور بڑے گھرانے کی عورتیں پالکی میں سفر کرتی تھیں بہرحال گھاٹ
پر ظاہر ہے۔ یہ جو عورتیں آتی تھیں وہ "پن" کمانے کے لئے گنگا نہانے
آتی تھیں اور وہ مذہبی خیالات رکھتی تھیں۔ وہ آج کی طرح عشق
لڑانے، دل بہلانے یا سیر و تفریح کے لئے گنگا کے کناروں پر پھرنے
والی عورتیں نہیں تھیں۔

پھر یہ "نازنین" کون تھیں؟ وہ کون تھیں
جو "اشارے" کیا کرتی تھیں۔ صاف بات یہ ہے کہ یہ "نازنین" پیشہ ور
طوائفیں تھیں۔ اٹھارویں صدی کے بعد سے جب کلکتے کا عروج شروع

ہوا، دلّی اور لکھنو کی رنگ برنگی محفلیں ماند پڑنے لگیں اور ہر جگہ سے دولت سمٹ کر کلکتہ آنے لگی۔ تب ہندستان کے کونے کونے سے حسن فروش عورتیں روپیہ کمانے کے لیے کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئیں اور بہت بڑی تعداد میں آ کر یہ حسینائیں کلکتہ میں بس گئیں

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے درمیانی دور کے شاعرات بنگالہ کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اُن میں سے بیشتر کا پیشہ حسن فروشی رہا ہے اس عہد کے شاعرات بنگالہ میں پری عرف بی میمو پہودن ۔ جعفری، منی بائی حجاب ، نوروز جہاں حور لکھنوی خورشید کانپوری ۔ منی جان زہرہ کاشمیری، نگن بائی زیب لکھنوی ، شباب ۔ چھوٹی صاحبہ بہ تخلص شرم لکھنوی ۔ مولا جان شوخ کانپوی شیرین جان شیریں لکھنوی ۔ فہمین جان ستم پنجابن ، بی صاحبہ معشوق پہودن ۔ بی بی جان ملکہ بنارسی ، ناز لکھنوی، ننھی جان نازاں عرف چھلبل ۔ حمیدن بائی نقاب اور گوہر جان ہمدم وغیرہ وغیرہ سب کلکتے میں رہتی تھیں اور ان سب کا پیشہ حسن فروشی رہا ہے ۔ غالب نے اپنے عہد کے حسن فروشوں کے گھروں کا کلکتہ میں بھی چکر لگایا ہوگا ۔ چونکہ یہ اس دور کے نواب اور رئیس زادوں کے لیے عزت کی بات سمجھی جاتی رہی ہے ۔ ان حسیناؤں کو ہی غالب نے "نازنین بتانِ خود آرا" قرار دیا ہے ۔ مذکورہ بالا شاعرات میں ننھی جان نازاں عرف چھلبل، غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں بہت مشہور و مقبول تھی ۔ یہ علم ہمیں اس دور کے

کے اخباروں سے ہوتا ہے۔ بنگلہ زبان کے قدیم اخبارات میں کئی ایسی خبریں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے رئیس اپنے گھروں میں شادی بیاہ، عید، پوجا اور دیگر خوشی کے موقع پر یا جب جی چاہے محفل رقص و سرود منعقد کرتے تھے۔ غالبؔ کے قیام کلکتہ کے دنوں ایسے رقص و سرود کی محفلوں میں حصہ لینے والی چند مشہور رقاصاؤں میں ننھی جان کے علاوہ بیگم جان، منگول جان، سوہن جان اور "نکی" کا نام ہم اخبارات میں بار بار پاتے ہیں۔ غالباً "نکی" اس زمانے کی رقاصاؤں میں سب سے زیادہ چہیتی حسینہ تھی۔ راجہ رام موہن رائے کے مانک تلہ والے مکان میں بھی ایک رقص میں "نکی" نے حصہ لیا تھا۔ جب محفل میں اس عہد کے کئی یورپین حضرات تک موجود تھے۔

ان ناچنے گانے اور دل بہلانے والی پیشہ ور حسیناؤں کے علاوہ غالبؔ نے "حور لندن" سے کافی دلچسپی لی ہے۔ جن کو انھوں نے "بتان سیم تن" کہا ہے۔ ان دنوں کلکتہ میں "بتان لندن" کی بے حد کمی تھی لہٰذا ان کی حد سے زیادہ قدر و قیمت تھی۔ ایک تخمینہ کے مطابق اٹھارویں صدی کے اواخر میں پورے بنگال میں (سوا فوجیوں کے) فرنگیوں کی تعداد کوئی چار ہزار تھی۔ اور "بتان لندن" صرف ۲۵۰ کے لگ بھگ تھیں۔ ایک ولایتی حسینہ کو لندن سے کلکتہ تک لانے میں

کم از کم ۵ ہزار روپیہ صرف ہوتا۔ چونکہ تجارت پر انگریزی کمپنی کا مکمل قبضہ تھا۔ اس لیے، جہاز کا کرایہ کمپنی من مانے لیتی تھی۔ ایسی حالت میں جب کوئی لندن کی جوان حسینہ، کلکتہ پہنچتی تو اس کی سواگت کے لیے، اس سے تعلقات بڑھانے کے لیے، اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے کلکتہ میں بسنے والے انگریزوں میں دوڑ دھوپ کا مقابلہ ہوتا، ایک ہلچل مچ جاتی اور ساحل دریا پر عاشقوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سب مل کر حسینہ کا سواگت کرتے۔ کئی دنوں تک اس حسینہ کی قیام گاہ پر اس کا جلوہ دیکھنے کے لیے سینکڑوں بے قرار دل انتظار کرتے اور کبھی کبھی تو رات رات بھر جاگ کر یہ عاشق ایک جلوہ کے منتظر رہتے تھے یعنی یہ

"عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب"

والی بات تھی۔ جو لندن کا ہاتھ لینے کے لیے، اس سے شادی کے لیے، سیکڑوں درخواستیں ان کی ان میں پڑ جاتیں اور عموماً دو تین دن کے اندر وہ "نازنین" اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیتی اور اس کے بعد دھوم دھام سے شادی ہوتی۔

شادی کے بعد بھی اس حسینہ کا ناز اٹھانا پڑتا۔ ورنہ خطرہ تھا کہ حسینہ روٹھ جائے گی اور جب دل چاہے

ان حسیناؤں کا کام صرف بننا سنورنا تھا۔ گھریلو کام کاج سے
ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ گھر کا پورا کام مختلف خدمتگار
ہی انجام دیتے تھے۔ یہ "بتانِ سیم تن" عموماً صبح نو بجے انگڑائیاں
لے کر بستر سے اٹھتیں۔ دوپہر کا کھانا ایک تا دو کے درمیان
کھا لیتیں اور پھر بستر پر لیٹ جاتیں۔ شام کے چار یا پانچ بجے اٹھ
کر، بن سنور کر کسی ناچ و رنگ کی محفل میں یا گنگا کنارے سیر
کرنے اور شباب کا لطف اٹھانے کے لیے اپنے عاشق کے ہمراہ
چلی جاتیں اور سینکڑوں دھڑکتے ہوئے دل ان کی مستانہ چال پر
تھام کر رہ جاتے۔

یہ ہے غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں
"بتانِ لندن" کی قدر و قیمت کا مختصر حال۔ بھلا ایسی "بتانِ لندن"
پر کسی شاعر کا دل نہ مچلے گا۔ اور وہ بھی غالب جیسا جوان
حسن پرست۔ مصحفی کی بکھی سا شاعر ان نظاروں سے دور
رہ کر رہ سکتا تھا۔ غالب نے بھی ان "بتانِ لندن" کے جلووں
۔ ان کے ناز و انداز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور لطف
اٹھایا۔ کم از کم اس وقت ضرور دیکھا ہو گا جب یہ حسینائیں دریائے
ہگلی پر کشتیوں میں رنگ رلیاں مناتی تھیں۔

غالب نے دریائے ہگلی پر جیسی کشتیاں
دیکھا (جس میں یہ حورِ لندن سیر و تفریح کیا کرتی تھیں) دیکھ…

کشتیاں آج کل نہیں ہیں۔ اس عہد کی یہ کشتیاں نہایت خوبصورت اور دلکش ہوتی تھیں۔ بنگلہ زبان میں ان کشتیوں کو "میور پنکھی" کشتیاں کہا جاتا ہے۔ یعنی مور کی پنکھ جیسی کشتیاں۔ ان کشتیوں کی چوڑائی ۶ تا ۸ فٹ اور لمبائی تقریباً ایک سو فٹ تک ہوتی تھیں۔ یہ کشتیاں کلکتہ سے چندن نگر اور چچورا تک جاتی تھیں۔ ایسی کشتیوں میں یہ فرنگی حسینائیں رنگ رلیاں مناتی تھیں اور غالب ان کو دیکھ کر دل پر ہزاروں زخموں کے داغ لئے کف افسوس ملتے ہوئے ساحل دریا سے لوٹ آتے رہے ہیں اور وہ ان نظاروں کو تا عمر بھلا نہیں سکے۔ ان گوروں کا دل جلا شاعر آخر ان کے سلسلے میں کوئی اچھی رائے کیونکر رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا غالب نے "ساقی بزم آگہی" میں بجا کہا۔

گفتم — ایں ماہ پیکراں چہ کس اند ؟
گفت — خوبانِ کشورِ لندن۔
گفتم — ایشاں مگر دلے دارند ؟
گفت — دارند لیک از آہن
گفتم — از بہر داد آمدہ ام
گفت — بگریز دسر بسنگ مزن

یعنی غالب نے گوروں کو دیکھ کر سوال کیا، یہ ماہ پیکر کون ہیں ؟ اور ان کو ساقی نے جواب دیا "یہ کشور لندن کے

حسین ہیں" پھر غالب نے پوچھا کہ "آیا ان کے پہلو میں دل بھی ہے؟"
ساقی نے جواب دیا "ہے۔ لیکن انسان کی طرح گوشت کا نہیں بلکہ لوہے کا ہے، جس پر کوئی اثر نہیں ہوتا جو درد سے بالکل عاری ہے"

اس پر غالب نے کہا "میں تو یہاں انصاف طلب کرنے آیا ہوں"
لیکن ساقی نے بالکل صاف جواب دے دیا "کاہے کا انصاف چاہتے ہو، کیسا درد ہے تمھارے دل میں، بہتر یہی ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بے کار اپنا سر یہاں پھوڑنے سے فائدہ۔ یہ پتھر ہیں۔ اپنا سر نہ پھوڑو۔"

آب و ہوا کی مدح سرائی۔
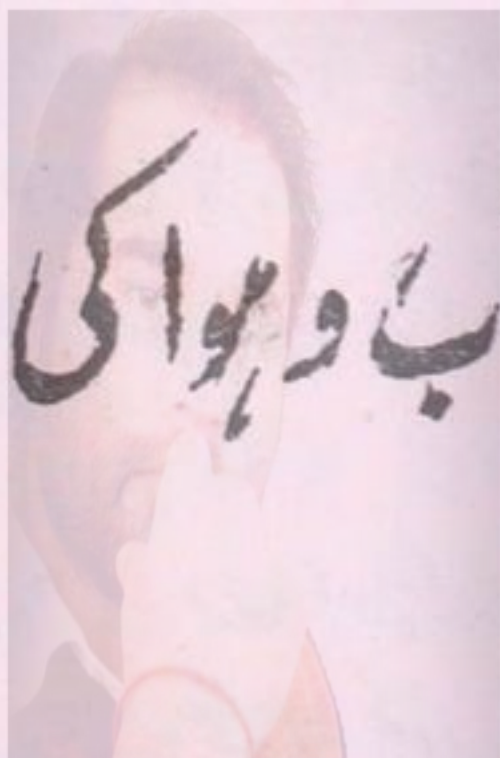
——— مرزا غالب نے شہر کلکتہ اور اس کی آب و ہوا کو پسند فرمایا اور اس کی تعریف کی ہے۔ لیکن ابوالکلام آزاد نے غالب کے اس خیال اور کلکتہ کی آب و ہوا کی مخالفت کرتے

کرتے ہوئے لکھا ہے بڑا

——— اٹھارویں صدی اور ۱۹ویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں۔ کلکتہ کو آب و ہوا کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں۔ سرجان اشور کے زمانے میں اٹھارویں صدی کا اختتام تھا ایک شاعر نے کلکتہ کی مذمت میں یہ قطعہ لکھا تھا۔

آب شور و زمین سراسر شور
"شور" فسرآں روائے کلکتہ
پارۂ از زمین دوزخ بود
کہ برآں شد بنائے کلکتہ
خارش و داد و ہیچش و اسہال
ایں ہمہ تحفہ ہائے کلکتہ

——— انگریزوں کی شہادت کا بھی تقریباً یہی حال رہا ہے۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان سرجان لارنس یہی لکھتے ہیں۔

——— ناممکن ہے کہ کلکتہ کی ناقص آب و ہوا میں بارہ مہینے رہ کر کام کیا جاسکے۔ امیر دوست محمد خان کو

---

۱ غالب اور ابوالکلام ۔ مرتبہ عتیق صدیقی

کو جب ۱۸۲۸ء میں کلکتہ لائے تو ابتدا میں وہ شہر کی رونق اور دریا کا کنارہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لیکن پھر ایک مہینہ بھی پورا نہ کر سکے۔ انہوں نے لارڈ آکلینڈ کو کہلایا کہ مجھے جلد کلکتہ سے رخصت کر دو ورنہ دنیا کہے گی کہ بڑے لاٹ صاحب نے دوست محمد کو مارنے کے لئے کلکتہ بلا کر رکھا تھا چنانچہ انہیں فوراً لدھیانہ بھیج دیا گیا۔"

——— کلکتہ کی آب و ہوا کو اس طرح ناقص قرار دینے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

"——— بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا غالب دو سال کلکتے میں رہے اور آب و ہوا کی ناموافقت، انہیں یک قلم محسوس نہ ہوئی۔ اتنا ہی نہیں وہ اس کی لطافت و خوشگواری کی مداحی میں جا بجا رطب اللسان ہیں۔"

——— آگے چل کر مولانا آزاد اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ۔

"——— مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و امیال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبے کا نتیجہ تھا۔ انگریزوں کے اوضاع و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی پسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ اس اعتبار سے بھی مرزا غالب اپنے عہد کے مستثنیات میں

سے ہیں۔ ان کا خاندان انگریزی حکومت سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اس لیے آنکھ کھولتے ہی وہ انگریزوں سے وابستہ ہو گئے۔"

کوثر چاند پوری نے بھی مولانا آزاد کے مذکورہ خیالات کی بھرپور تائید کی ہے اور مذکورہ مثالوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ[۱]

"اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تحریرات میں نہ صرف کلکتہ کی آب و ہوا بلکہ وہاں کے باشندوں کی بھی مذمت کی گئی چنانچہ شعری کشمیری جو غالب کے بہت بعد کلکتہ گئے تھے فرماتے ہیں۔

نہ دیدم مردمی در دیدۂ اعیان کلکتہ
زنیش لاف بیہودہ زدہ کوران کلکتہ

وغیرہ وغیرہ اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"(غالب) نے کم عمری ہی سے انگریزوں کو دیکھا تھا۔ اسی بنا پر وہ کلکتہ کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ وہاں انگریزی تمدن کا چراغ جل رہا ہے۔ ان کی نگاہ نہ تو آب و ہوا کی خرابی پر پڑتی ہے، نہ وہاں کے باشندوں کی

---

[۱] جہان غالب ۔ از کوثر چاند پوری

برائیاں نظر آتی ہیں وہ ان شعراء سے اتفاق نہیں کر سکے جو کلکتے میں عیب نکالتے ہیں۔"

بنیادی طور پر مولانا آزاد کے مذکورہ خیالات کی وجہ سے اردو دان طبقہ میں یہ خیال عام ہے کہ غالب نے یوں ہی کلکتے کی آب و ہوا کی تعریف کی ہے اور مولانا آزاد کی مخالفت بجا ہے یہ محض اس لئے ہے کہ ان کے سامنے تصویر کا ایک رخ ہی ہمیشہ رکھا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ غالب بنگال و کلکتہ کی تعریف کرنے میں کس حد تک حق بجانب تھے۔ بنگالہ کی آب و ہوا کی مدح سرائی میں غالب کی یہ رباعی ہے۔

غالب ہر پردہ نوائے دارد
ہر گوشہ از دہر قضائے دارد
ہر چیدہ بوسعت زد عالم یکسر
بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارد

اس کے علاوہ مختلف خطوط میں بھی غالب نے کلکتہ کی آب و ہوا کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں مولوی سراج الدین کو لکھتے ہیں۔

"ہوا ہائے سرد و خوشا آب ہائے، گوارا فرما۔ بادہ ہائے، ناب و فرما ثمر ہائے، شیریں۔"

ـــــــــــ ایک اور خط میں لکھتے ہیں ؎۱

ـــــــــــ "آب و ہوائے کلکتہ مجھے سازگار ہے۔"

ـــــــــــ ایک اور خط میں فرماتے ہیں ؎۲

ـــــــــــ "آب و ہوائے کلکتہ خوشنود یوں"

یا پھر "کلکتہ کی آب و ہوا بھی مقابلۂ دہلی سے سازگار تر ہے"

ـــــــــــ غالب کے مذکورہ اقتباسات کے بعد اب ہم مولانا آزاد کے بیان پر غور کریں۔ بقول مولانا آزاد چونکہ غالب انگریزوں کی پسند کو اپنی پسند قرار دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں انہوں نے کلکتہ کی آب و ہوا کی تعریف کی ہے ۔ یہ خود مولانا آزاد کی منطق کے مطابق غلط ہے۔ کیونکہ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے انگریزوں نے کلکتہ کی آب و ہوا کی مخالفت کی ہے ۔ اور اگر غالب کو محض انگریزوں کی مدح خوانی ہی کرنی ہوتی تو وہ بھی یہی باتیں لکھتے تاکہ انگریز خوش ہوں۔ لیکن غالب نے ایسا نہیں کیا ہے۔ یعنی اگر انگریزوں نے "برا کہا ہے "ناقص" قرار دیا ہے تو غالب نے "بہتر" اور "سازگار" قرار دیا ہے اس لحاظ

؎۱ اور ؎۲ مجموعہ ۔ دہلی اور غالب ۔ قاضی عبدالودود ۔ غالب نمبر رسالہ "اردو" کراچی ۱۹۶۹ء

سے غالب پر مولانا آزاد کا مذکورہ الزام ثابت نہیں ہوتا۔

______ مولانا آزاد (اور ان کے نقش قدم کو ثمر چاند پوری وغیرہ) نے "کلکتہ کی آب و ہوا کی مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ۔" اٹھارویں اور انیسویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں کلکتہ کو آب و ہوا کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں۔" لیکن یہ بیان بھی مکمل طور پر حق بجانب نہیں ہے۔ بنگال نیز کلکتہ کی آب و ہوا کے سلسلے میں بہت سی متضاد رائیں ملتی ہیں عہد قدیم یعنی بارھویں صدی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک کے سفرناموں میں جہاں بھی جس کسی نے سرزمین بنگالہ اور اس کی آب و ہوا کا ذکر چھیڑا ہے، اس نے اس دھرتی کے گن گائے ہیں۔ مثلاً دربار اکبری یا سفرنامہ ابن بطوطہ وغیرہ۔ اس کے بعد کے آنے والے کئی سیاح نے بھی بنگال کی آب و ہوا، زمین و پیداوار کے سلسلے میں لکھا ہے اور اس دھرتی کو جنت قرار دیا ہے۔ ابن بطوطہ کے تقریباً تین سو سال کے بعد یعنی سترہویں صدی کے دوسرے حصے میں فرانسو بارنیر نے دو بار بنگال کا سفر کیا ہے اور ان کا طویل سفرنامہ موجود ہے۔ جس میں اس نے اس ملک کے چپے چپے کا حال قلم بند کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"______ صدیوں سے ادیبوں نے ملک مصر کو سنہرا ملک یا سونا اگلنے والی دھرتی لکھا ہے۔ ان کے مطابق

پھلوں اور پھولوں سے بھرپور ایسا ملک دنیا بھر میں
کہیں نہیں ہے اور اب بھی کئی لوگوں کا یہی خیال ہے
لیکن میں نے دو بار ملک بنگالہ کا سفر کیا ہے اور
میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ آج
تک مصر کے سلسلے میں کہا گیا ہے وہ درحقیقت بنگال
پر صادق آتی ہے۔ اسی لئے پرتگیز۔ ڈچ اور انگریزوں
میں کہاوت ہے کہ ملک بنگالہ میں آنے کے لئے کئی راستے
ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ جانے کے لئے کوئی راستہ
نہیں ہے ...... قدرتی حسن اور زرخیز زمین کے سلسلے
میں بنگال کو اولیّت حاصل ہے۔"

محترمہ فے۔ ناصنی (عہد وارن ہسٹنگز میں
کلکتہ ہائیکورٹ کے ایک نامور بیرسٹر مسٹر انٹونی کی بیوی) نے انگلستان
میں اپنے خاندان والوں کو ایک خط میں کلکتے کی آب و ہوا کا ذکر کرتے
ہوئے لکھا ہے۔

انگلستان میں رہتے ہوئے سنا تھا کہ بنگال
کی آب و ہوا سے بھوک مرجاتی ہے۔ لیکن مجھے یہ بات
تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے کہ مجھے یہاں اس کا کوئی عملی ثبوت
نہیں ملا۔ برعکس مجھے تو یہاں اتنی کھل کر بھوک لگتی ہے
جتنی کہ مجھے پہلے کبھی نہیں لگتی تھی اس گرمی کے موسم

میں بھی ہم یہاں دو بجے خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں۔"

——— اٹھارویں صدی کا ایک اور انگریز سیاح ولیم ہاڈجس (WILLIAM HODGES) نے انگلستان میں اپنے سفرنامہ میں بنگال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[1]

"——— پورا ملک بنگالہ ہرے بھرے کھیتوں سے بھرپور ہے۔ یہاں بکثرت گائے، بھینس اور دیگر مویشی میں نے دیکھے ہیں۔ یہاں کے دیہات نہایت صاف ستھرے ہیں اور لوگوں کی آبادی معقول ہے۔"

——— جیسا کہ مذکورہ سیاح اور پردلیسیوں نے لکھا ہے غالب بھی بنگال کے سلسلے میں لکھتے ہیں[2]

"——— اگر میں عنفوان شباب میں وہاں (بنگال) گیا ہوتا اور شادی اور خانہ داری کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو میں مدت العمر کے لئے کلکتہ ہی میں رہ جاتا۔" یا یہ کہ[3] " جنت البلاد بنگالہ ہی میں رہنا ہوتا، مگر اس خارزار اور غولستان میں

۱۔ ٹراولس اِن انڈیا۔ سنہ ۱۷۹۳ء

۲۔ کلیات نثر فارسی

۳۔ خطوط غالب حصہ اول مرتبہ غلام رسول مہر

واپس آنا پڑا۔" یا پھر علائی کے نام لکھتے ہیں ـــــ

"ـــــ برسوں کے بعد جیل خانہ (دہلی) سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجلس میں بٹھا دیا۔"

ـــــ یہاں غالب نے بنگال کو "جنت البلاد" کہا ہے اور اس عہد میں ہندستان کے مسلمان بنگال کو "جنت البلاد" ہی کہتے تھے۔

ـــــ اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند فارسی و اردو شعراء کی رائیں بھی دی جائیں۔ چونکہ آزاد اور کوثر کے مطابق فارسی اور اردو کے تمام شعراء نے بھی بنگالہ کی آب و ہوا کی مخالفت ہی کی ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ مثلاً فارسی کا ایک مایہ ناز شاعر منیر لاہوری جو مرزا غالب سے بہت قبل بنگال آئے تھے (قیام بنگال کا زمانہ ۱۰۴۸ھ مطابق ۱۶۳۸ء) نے بھی اپنی مشہور مثنوی "در صفت بنگالہ" میں اس سرزمین کے گن گائے ہیں اور آب و ہوائے بنگالہ اور یہاں کا حسن و پیداوار کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ بقول ڈاکٹر ناظر حسن زیدی یہ مثنوی "نازک خیالیوں اور مضمون آفرینیوں کے لئے مشہور ہے۔"

۱۔ خطبات گارساں دتاسی صفحہ ۱۲۵

مثنوی کو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے[1]۔ سر جان شور کے زمانے کے جس دل جلے شاعر کے ہجویہ اشعار کو مولانا آزاد نے پیش کیا ہے اس کے جواب میں اسی عہد کے ایک اور فارسی شاعر وحید کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، جو مولانا آزاد کی نظروں سے غالباً نہیں گذرے ہیں فرماتے ہیں ۔

چیست دانی تو شہر مینو چہر شہر نزہت فزائے کلکتہ

بر زمینے ز باغ خلد بریں گوئیا شد بنائے کلکتہ

می بوید بوئے گلشن فردوس بچمن خوش ہوائے کلکتہ

گرہ از دل کشائے نافہ چین نکہت مشکہائے کلکتہ

یاد باغ جناں برد از دل باغ دلبراں سرائے کلکتہ

طائرِ جانِ ناتوان وحید

می پرد در ہوائے کلکتہ

مذکورہ رائیں جن میں بنگال اور اس کی آب و ہوا کی تعریف کی گئی ہے، پر غور کرنے کے بعد ہم اب غالب کے حالات پر غور کریں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ غالب بنگال آکر کبھی بیمار نہیں پڑے ان کی صحت کو یہاں کی آب و ہوا راس آئی۔ یہاں کی گرمی کا انہوں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن موسم گرما میں یہاں کے لوگ کچا ناریل

---

[1] "مثنوی در صفت بنگالہ" پر ڈاکٹر زیدی کا ایک طویل مضمون قسط وار سہ ماہی "صحیفہ" لاہور دس سالہ نمبر میں شائع ہوا ہے۔

(ڈاب) کا پانی پیتے ہیں جو صحت بخش ہے۔ کا بھی غالب نے ذکر کیا ہے اور وہ خود بھی ڈاب کا میٹھا پانی مزے لے کر پیتے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:[11]

آب و ہوائے کلکتہ مجھے سازگار ہے۔
شدت گرما میں ناریل کا تازہ پانی باضابطہ قند و نبات ثابت ہوا۔ آج کل برسات کا موسم ہے، میں نے اس کا استعمال ترک کر دیا ہے۔ عوارض بدنی کی شکایات نہیں، بلکہ یہاں دہلی سے بہتر ہوں۔"

یہ کہنا کہ غالب انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے شاعری کرتے تھے۔ غالب کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ ان کے دل میں جہاں انگریزی ایجادات کی عزت تھی وہاں وہ انگریزوں کی برائیوں سے بھی آگاہ تھے اور اس عہد میں جب انگریزوں کے خلاف لب کشائی ممکن نہیں تھی غالب نے (لاکھ ڈھکے چھپے الفاظ ہی میں کیوں نہ ہو) اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے حالانکہ پنشن کے لئے ان کو کئی قصائد لکھنے پڑے۔ اس کے باوجود یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ اور دیکھنے والی نگاہ بڑی آسانی سے اس بات کا سراغ لگا سکتی ہے کہ غالب کے دل میں انگریز کرداروں سے اتنی محبت نہیں تھی

---

[11] مجموعہ دہلی اور غالب از قاضی عبدالودود

جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ غالب کے کلیات فارسی کا وہ قطعہ جس میں "ساقی بزم آگہی" سے گفتگو ہے اور جس کے سلسلے میں غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ "یہ قطعہ غالباً ۱۸۲۸ء یا ۱۸۲۹ء کا ہے جب مرزا کلکتہ میں تھے۔" کے یہ اشعار غور طلب ہیں:-

گفتم :- این جا چہ شغل سود دہد؟
گفت :- از ہر کہ ہست نہ رسیدن
گفتم :- این جا چہ کار باید کرد؟
گفت :- قطع نظر ز شعر و سخن۔

یعنی غالب نے سوال کیا کہ کلکتے میں کون سا شغل سود مند ہو سکتا ہے۔؟ اور ساقی نے جواب دیا کہ یہاں جو کچھ ہے اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ (کیوں ڈرتے رہنا چاہیے؟ اس لیے کہ یہ لوگ حاکم ہیں) غالب نے پوچھا۔ آخر یہاں کون سا کام کرنا چاہیے۔ جواب ملا۔ شعر و سخن سے دور رہنا چاہیے۔ اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ کیونکہ انگریزوں کو شعر و سخن سے قطعاً کوئی واسطہ و علاقہ نہیں ہے۔" ایسی حالت میں یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے کہ محض انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے غالب نے کلکتے کی آب و ہوا کی مدح سرائی کی ہے۔!

بنگال کی آب و ہوا کے سلسلے میں جو رائیں۔ مثال کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ان پر غور کرنے سے ایک بات صاف ہو جاتی ہے وہ یہ کہ قدیم عہد سے لے کر تقریباً ۱۸۳۵ء تک کا زمانہ

دہ ہے جب کہ ہمیں کلکتہ کی آب وہوا کی مخالفت نہیں ملتی ہے۔ اس کے بعد سے کلکتے کی آب و ہوا کے بگڑنے اور کلکتے میں مختلف بیماریوں کے پھیلنے کی خبریں کلکتہ کے اخبارات۔ سفرناموں اور شعرا کے کلام وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کلکتہ مختلف بیماریوں کا گھر لگ بھگ ۱۸۳۹ء کے بعد سے بنا ہے اور اس شہر کی آب و ہوا کے بگڑ جانے کے وجوہات اور شہر سے بیماریوں کو دور کرنے کے لئے اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں طوالت کے خوف سے مثالیں پیش نہیں کی جارہی ہیں۔ اور یہ غیر ضروری بھی ہے۔ لیکن مختلف مضامین میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۳۵ء کے بعد سے کلکتے کے لئے وہ عہد شروع ہوا۔ جب شہر کے دامن میں گھنی گھنی بستیاں آباد ہوگئیں ان بستیوں کی آبادی حد سے زیادہ تھی۔ صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے مچھر اور مکھیوں کی فوج میں اضافہ ہوا۔ اس عہد کے کئی بنگالی شعراء نے بھی کلکتہ میں مکھی اور مچھر کا رونا رویا ہے اور کئی مزاحیہ نظمیں کہی ہیں۔ اس زمانے میں پینے کے پانی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پہلے شہر میں کئی بڑے "پوکھر" (تالاب) تھے اور ان میں سے ہر تالاب ۳-۴ بگھا زمین پر ہوا کرتا تھا۔ جہاں لوگ نہاتے اور جن کا پانی پینے کا کام بھی آتا۔ لیکن آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے زمین کی قیمتیں بڑھ گئیں اور تالابوں کا سائز روز بروز گھٹتا گیا۔ یعنی اب تالاب ۸-۱۰ کٹھا یا اس سے بھی کم زمین میں کھودے جانے لگے جس کی وجہ سے پانی

بہت جلد گندہ اور زہریلا ہو گیا۔ اور شہر میں بیماریاں پھیلنے کا بہت بڑا سہارا یہ چھوٹے تالاب بن گئے۔

——— بہر حال تاریخ کلکتہ سے یہ بات واضح ہے کہ کلکتے کی آب و ہوا ۱۸۳۵ء کے بعد سے بگڑی ہے اور ۱۸۷۵ء تک یہ شہر ہیضہ ملیریا۔ چیچک وغیرہ کا گھر بنا رہا ہے۔ اس کے بعد یہاں کی آب و ہوا میں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئی ہیں۔ لیکن آبادی اتنی تیز رفتار بڑھتی گئی ہے کہ آج بھی کالرا ہر سال ہوتا ہے۔ حالانکہ ملیریا کا خوفناک دور اب ختم ہو چکا ہے۔

——— غالب ۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۰ء اس شہر میں تھے اور اس عہد میں کلکتہ بیماریوں کا گھر نہیں تھا۔ لہٰذا تاریخ کی روشنی میں غالب، آب و ہوائے کلکتہ کی مدح سرائی کرنے میں حق بجانب نظر آتے ہیں اور جن لوگوں نے آب و ہوائے کلکتہ کی مخالفت کی ہے ان کا زمانہ غالب کے قیام کلکتہ کے بعد کا زمانہ ہے اور مولانا آزاد و کوثر چاندپوری نے جن تصانیف کا حوالہ دیا ہے یا جن حضرات کا ذکر کیا ہے وہ سب غالب کے کلکتہ سے چلے جانے کے بعد ہی کلکتہ آئے تھے۔ مولانا آزاد اور ان کے ہمخیال حضرات نے جس سختی سے غالب کی مخالفت کی ہے اگر ان کی باتوں کو حالات پر غور نہ کرتے ہوئے درست تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ غالب نے محض انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے آب و ہوائے کلکتہ کی تعریف کی ہے تو غالب کی عظمت اور اس کا کردار کوہ ہمالہ

کی بلند چوٹی سے یکا یک ایک اندھیرے خندق میں آ گرے گا اور غالب اپنے زمانہ کا ایک حقیقی شاعر ہونے کے بجائے محض انگریزوں کا ایک خوشامد پرست شاعر چاپلوسی کرنے والا۔ سچی باتیں کہنے کی جرأت نہ رکھنے والا، ایک ذلیل و کم ظرف شخص بن کر رہ جائے گا۔ غالب لاکھ خوشامد پرست سہی۔ ضرورت مند سہی۔ قصیدے کہنے والا سہی، لیکن ان تمام کے باوجود غالب کے کردار کو ہم اتنا ذلیل و خوار کرنے گرا دینے پر کیونکر تیار ہو سکتے ہیں جب غالب کی مکمل زندگی ہمارے سامنے آئینہ کی طرح صاف ہے۔

کوثر چاندپوری نے غالب پر یہ الزام بھی لگایا کہ غالب کی نگاہ میں "وہاں کے (بنگال کے) باشندوں کی برائیاں بھی نظر نہیں آتی ہیں۔" آب و ہوا کا ذکر کیا جا چکا ہے لہٰذا اب اس الزام پر بھی کچھ غور کریں۔ ماحول اور حقائق کی روشنی میں کوثر چاندپوری کا یہ الزام بھی درست نہیں ہے۔

انسانی کردار۔ اس کا چال چلن۔ عادتیں وغیرہ آسمان سے نازل نہیں ہوتی ہیں۔ جغرافیائی ماحول، پیداوار وغیرہ کا انسانی عادتوں پر گہرا اثر ہے۔ اور ایک قوم کا کردار۔ اس کا تہذیب و تمدن۔ رسم و رواج ہر چیز پر جغرافیائی حالات اثر کرتے ہیں لہٰذا ہر مقام کے لوگوں کی عادتیں۔ ان کا تہذیب و تمدن میں فرق ہوتا ہے۔ عام طور پر ہر مقام کے باشندوں میں جہاں کئی اچھائیاں

وتی ہیں وہاں چند برائیاں بھی۔ اور اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنا
بلکہ نہایت نازک اور مشکل کام ہے۔ مثلاً ایک ملک کے لوگ جسے
لذیذ و مرغوب غذا سمجھتے ہیں کسی اور ملک میں اسے کھایا نہیں جاتا
اس سے نفرت کی جاتی ہے۔ پھر شخصی طور پر ہر شخص کو عموماً وہ عادات
طریقے برے معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا وہ خود عادی نہ ہو یا جس کا اس کے
اپنے سماج میں چلن نہ ہو یعنی اچھائیاں اور برائیاں ماحول کی
پرداخت ہیں اور ایک مقام کے لوگ جسے اچھا خیال کرتے
یہ ضروری نہیں کہ دوسرے مقام کے لوگ اسے اچھا ہی سمجھیں۔

پچھلے صفحات میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ غالب
کلکتہ آنے کے باوجود مقامی بنگالیوں سے دور رہے ہیں اور ان کے
ملنے جلنے والوں میں عموماً باہر سے کلکتہ آئے ہوئے لوگ ہی رہے
، لہٰذا ان کو بنگالی سماج کا تجربہ نہیں رہا ہے۔ اس کے باوجود
غالب نے بنگال کے باشندوں (جو اس لحاظ سے بنگالی تھے کہ
عرصے سے یہاں آباد تھے) کی چند برائیوں کا ذکر کیا ہے جو
کی نظر میں کھٹکتی رہی ہیں۔ ہمیں غالب کے خطوط میں دیسی
باتیں ملتی ہیں۔ برائیاں ملتی ہیں جو غالب کو پسند نہیں ہے
۔ بنگال کے لوگوں کی زبان دانی (یعنی اردو بولنے کی کوشش
، چونکہ ان کی زبان دہلی کی اردو نہیں تھی) کا مذاق اڑاتے
ے مردان علی خان رعنا کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے

—— بھائی جفا کے مونث ہونے میں اہلِ دلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق کیا ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں ہتھنی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں ورنہ ستم و ظلم و بیداد مذکر اور جفا مونث ہے "۱

—— ایک اور خط میں بنگال کے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ بنگال کے لوگ آدھی بات کہنے یا آدھا کام انجام دینے کے عادی ہیں۔ وہ سید احمد حسن سے گذارش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ[۲]

"—— تیسری بات یہ ہے کہ جب نوٹ بھیجیے، تو اہل کلکتہ کی طرح آدھا آدھا دو بار کرکے نہ بھیجیے گا"۔

—— اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غالب نے اپنے انداز میں اہل بنگال کی کمزوریوں اور برائیوں پر نظر ڈالی ہے۔

مدرسہ عالیہ کا مشاعرہ

—— مرزا غالب کی زندگی میں دو بڑے ادبی ہنگامے ہوئے۔ ایک کا براہ راست تعلق (مدرسہ عالیہ کا مشاعرہ) کلکتہ سے ہے

۲۔ مجموعہ دہلی اور غالب۔ قاضی عبدالودود

اور دوسرا (قاطع برہان) ہنگامہ حالانکہ کلکتہ میں نہیں ہوا پھر بھی بنگال کے اہل قلم حضرات نے اس ہنگامے میں اہم حصہ لیا جس سے غالب متاثر ہوئے اور ان کو بنگال والوں کا جواب دینا پڑا۔

جب مرزا کلکتہ آئے ان دنوں ہر انگریزی ماہ کے پہلے اتوار کو مدرسہ عالیہ کلکتہ میں اس مدرسہ کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ جس میں فارسی اور اردو کے نامور شعراء شریک ہوتے اور اپنا اپنا کلام سناتے تھے۔ مشاعرے میں شعرائے کرام کی نشست مدرسہ کی موجودہ عمارت کے مغربی برآمدے میں ہوا کرتی تھی سامعین کھلے صحن میں فرش پر بیٹھا کرتے تھے۔ اس بات کی تحقیق نہیں ہو سکی کہ کس تاریخ کو غالب کے متعلق یہ ہنگامہ پرور ادبی مشاعرہ ہوا تھا۔ لیکن یہ درست ہے کہ غالب کے قیام کلکتہ کے ابتدائی دو تین ماہ کے اندر ہی یہ واقعہ پیش آیا ورنہ غالب کے لیے نہ اس کی ضرورت تھی کہ وہ مخالفین کے جواب میں "باد مخالف" لکھیں اور نہ ہی انہیں باد مخالف لکھنے کا وقت کلکتہ میں ملتا "باد مخالف" سے یہ بھی واضح ہے کہ ان دنوں غالب کو اس کا کامل یقین تھا کہ جس مقدمہ کی کارروائی کے سلسلے میں وہ اتنی دور آئے ہیں، میں ان کو کامیابی ہوگی لہذا وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ مقامی بااثر لوگوں کے سہارے سے وہ محروم ہو جائیں اس لئے انہوں نے سخت مخالفت سے پرہیز کیا۔

——— غالب نے کئی فارسی اور اردو خطوط میں اس مشاعرے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ماہرین غالب اس بات پر متفق ہیں کہ غالب کی زندگی میں اس مشاعرے کو بہت بڑا دخل رہا ہے۔ ایک خط میں ان پر جو اعتراضات کیے گئے تھے کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے:[۱]

"——— میں کلکتہ آیا تو بہت سے لوگ نکتہ چینی پر آمادہ ہوئے۔ جمعیتی خاص از برائے پراگندگی ساختند۔

...... صحبت دوم میں۔ میں نے غزل کے دس بارہ شعر پڑھے۔ حکیم ہمام کے مقطع سے اس کی زمیں معلوم ہو گی ؎

در میاں من و دلدار ہمام است حجاب
دارم امید کہ ایں ہم ز میاں برخیزد

ایک ہفتہ کے بعد خبر ملی کہ ایک بے دانش نے شعر ذیل۔

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

پر یہ اعتراض کیے ہیں "ہمہ" لفظ "عالم" کے ساتھ جو مفرد ہے درست نہیں ہے ...... بیش کی جگہ "بیشتر"

---

[۱] مجموعہ دہلی اور غالب ۔ قاضی عبدالودود

چاہیے۔ رستن موئے بر سر معشوق عقلاً ..... رستن موئی دبزہ کو بر خاستن سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ اعتراضات و معترض کو میزان نظر میں تولا تو زحمت جواب کی ضرورت نظر نہ آئی ...... میرے شعر

شور اشکی بفشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سرو سامانی طوفاں زدہ

پر یہ اعتراض کیا کہ "زدہ" مضاف الیہ ہے، جواب دیا گیا کہ "زدہ" کا کسرہ اضافی نہیں۔ یائے وحدت (کذا) ہے تو دوسرا اعتراض کیا کہ "زدہ" خبر یعنی معقول نہیں آتا اس کا جواب مثنوی میرا ہے۔ مخالفین میں سے ایک بزرگ نواب سید علی اکبر خان کے پاس گئے، اور میری شکایت کی کہ آپ کا نیاز مند اسد اللہ جلسوں میں شوخی کرتا ہے، مغلوب الغضب ہے۔ اور زبان دراز۔ اسی صحبت میں جس کا ذکر آیا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی مخاطب صحیح اور پارسی دان مسلّم نہیں کہ فیصلہ کر سکے۔ ان بزرگ نے اسی کلمۂ درد مندانہ کو اس طرح پیش کیا کہ یہ گویا سب کی توہین تھی۔ نواب نے مجھے نصیحت کی اور سرزنش کی کہ یہاں سخن پروری اور شعر گوئی کے لیے نہیں آئے۔ راہ دشوار ہے اور راہزن بہت۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا کروں کہ اس کی تلافی

ہو۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ معذرت نامہ لکھو اور مجھے بھیجو کہ میں مخالفین کو دکھاؤں۔ میں نے قبول کیا۔ مثنوی نظم کی۔ اس کا آشتی نامہ نام رکھا اور ناصح محسن کو بھیج دی۔"

غالب کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ جب کسی بھری محفل میں ان کے اشعار پر سخت تنقید کی گئی ہے اور پہلی بار غالب کو احساس ہوا کہ ان پر بھی نکتہ چینی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا مستقبل کے لئے غالب کو سنبھلنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب تک کسی فن کار پر مخالفین کی طرف سے اعتراضات نہ ہوں۔ تنقید و تبصرہ نہ ہو اس وقت تک وہ فن کار اپنے آپ کو "شہنشاہ" ہی تصور کرے گا۔ لیکن جب مخالفت ہو نکتہ چینی ہو۔ تنقید ہو۔ تب فن کار کو اس بات کی ضرورت محسوس ہوگی کہ وہ ہر نقطۂ نظر سے اپنے فن کا جائزہ لے۔ پرکھے، اعتراضات پر غور و فکر کرے۔ مطالعہ کرے اور اس طرح اس کے علم میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگی اور فن کار کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار ہوگا۔ حالانکہ غالب کا سفر کلکتہ ان کے لئے مالی طور پر مفید ثابت نہیں ہوا۔ لیکن ادبی نقطۂ نظر سے اس سفر کی اہمیت انمول ہے۔ چونکہ اس سفر نے انہیں زندگی کا گہرا تجربہ حاصل کرنے اور ادبی دنیا کے سامنے آنے اور مستقبل کے لئے راستہ ہموار کرنے میں مدد دی ہے۔

مرزا غالب کو اپنی فارسی شاعری اور فارسی
دانی پر ناز تھا۔ وہ ہندستان کے فارسی شعراء میں امیر خسرو دہلوی
کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے غالب کے کلام پر مذکورہ
مشاعرے میں جو اعتراضات ہوئے ان میں سنداً قتیل کو پیش کیا
گیا تھا۔ بقول غالب رئیس کفایت خان کے جواب سے بھی سامعین
کو تسلی نہیں ہوئی اور اب تک غالب خاموش تھے۔ لیکن قتیل
کا نام آنے پر انہوں نے قتیل کو سند ماننے سے صاف انکار کرتے
ہوئے تلخ لہجے میں جواب دیا "قتیل کون؟ وہ فرید آباد کا
کھتری بچہ! میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔" غالب کے
اس سخت جواب پر مشاعرے میں ہلچل مچ گئی۔ مولوی احمد علی
گوپاموی (پرنس غلام محمد کے میر منشی) احمد وجاہت علی لکھنوی
(دفتر انشا گورنر جنرل بہادر کا ایک ملازم) اور دیگر کئی شاگردان
قتیل جو اس بزم سخن میں حاضر تھے۔ بگڑ گئے اور اعتراضات کی بھرمار
کر دی۔ کفایت خان کے علاوہ مولوی محمد حسن۔ مولوی عبدالکریم
اور نواب علی اکبر خان نے غالب کی طرفداری کی تھی۔ لیکن اس سے
کچھ فائدہ نہ ہوا اور جیسا کہ غالب نے لکھا ہے 'آخر کار اپنی مصلحت کے
پیش نظر علی اکبر خان کے کہنے پر غالب نے یہی بہتر سمجھا کہ کلکتہ کے شعرا
سے دشمنی سے پرہیز کیا جائے' اور اس لئے انہوں نے "باد مخالف"
لکھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سفر کلکتہ نے فارسی ادب کو غالب

کی طرف سے دو شاندار مثنویاں عطا کی ہیں۔ پہلی مثنوی "چراغ دیر" ہے جو انہوں نے سفر کلکتہ کے دوران قیام بنارس سے متاثر ہو کر کہی اور دوسری مثنوی "باد مخالف" مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مشاعرے کی پیداوار ہے۔ حالانکہ "باد مخالف" بھرپور تلخی اور طنز لیے ہوئے ہے پھر بھی اس میں غالب نے بڑی خوبی سے اپنی پریشان حالی، بربادی اور کلکتہ میں ان کی آمد کی وجہ کا نقشہ کھینچا ہے اور اس اعتبار سے ان کی دکھ بھری زندگی کا نہ صرف ترجمان ہے بلکہ ان کی پہلی تنقیدی نظم بھی ہے۔ "باد مخالف" لکھنے پر غالب تیار نہیں تھے۔ لیکن جیسا کہ غالب نے مرزا احمد بیگ تپاں کے نام خط میں لکھا ہے کہ ان کے خلاف شورش محض مشاعرہ گاہ کی چار دیواری تک محدود نہیں رہی بلکہ راستہ چلتے ہوئے لوگ تک ان پر آوازیں کسنے لگے تھے اور اس مثنوی کو لکھ کر جواب دینے کے لیے غالب کو ان کے محسن نواب علی اکبر خان اور مولوی محمد حسن نے مجبور کیا تھا۔ چونکہ یہ محسن غالب چاہتے تھے کہ تمام اعتراضات کا جواب دیا جائے اور کلکتہ کے بااثر مخالفین سے معافی مانگ لی جائے۔ لہٰذا غالب نے مثنوی کہی اور اپنے قیام کلکتہ کے دوران ہی کلکتہ سے اسے چھپوا بھی دیا اس طرح غالب کا کلام ایک کتابچہ کے طور پر بار اوّل کلکتہ سے شائع ہوا۔

——— آغاز مثنوی میں اکابر کلکتہ کی تعریف غالب نے یوں کی ہے۔

اے تماشائیان بزم سخن | وی مہاد مان نادرہ فن
اے سخن پروران کلکتہ | وی زبان آوران کلکتہ
اے گرامی فنان ریختہ گو | تغز دریا کشان دعربدہ جو

یعنی معافی کے انداز میں بھی اہل کلکتہ کو "ریختہ گو" کہہ کر غالب نے شعرائے کلکتہ پر طنز کی ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی غالب نے قتیل کے شاگردوں کو خوش کرنے کی غرض سے لکھی۔ اس کے باوجود قتیل کی ہجو کا پہلو بھی اس کے دامن میں پوشیدہ ہے۔ چونکہ غالب نے یہاں اپنے آپ کو بیدل۔ عرفی۔ نظیری اور ظہوری کا شیدائی کہا اور کہا کہ میں بھلا قتیل اور واقف کو کیا جانوں۔

گرچہ بیدل ز اہل ایران نیست | لیک ہمچو قتیل ناداں نیست
صاحب جاہ و دستگاہی بود | مرد را زیں نمد کلاہی بود
آنکہ طے کردہ ایں موافق را | چہ شناسا قتیل و واقف را

اتنا کچھ کہنے کے بعد کہ بیدل اہل ایران نہیں پھر بھی وہ قتیل جیسا "ناداں" نہیں۔ غالب کو فوراً خیال آیا کہ شاید اس سے بھی قتیل کے ماننے والے بگڑ جائیں اس لئے پھر انہوں نے رخ بدلا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے کلکتہ سے چلے جانے کے بعد کلکتہ والے ان کو برا بھلا کہیں گے ۔ انہوں نے کہا۔

آہ ازاں دم کہ بعد رفتن من | خون دل ... گردن ...

——— مدرسہ عالیہ کے مشاعرے میں غالب پر جو اعتراضات ہوئے اور غالب نے جو کچھ جواب دیا تھا اس پر کئی اہل قلم حضرات نے روشنی ڈالی ہے اور سید لطیف الرحمٰن صاحب نے کھل کر بحث کی ہے [1] اس لیے یہ ضروری نہیں کہ ان باتوں کو پھر سے دوہرایا جائے۔ لطیف صاحب بنگال کے باشندہ ہونے کے علاوہ مدرسہ عالیہ کے ایک متعلم ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں ان کی تصنیف دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

——— غالب کی مثنوی "باد مخالف" میں چند اشعار ایسے بھی ہیں جو ان کے دیوان فارسی میں ایک طرح ہیں تو "مجموعہ دہلی" (نیشنل آرکائیوزی دہلی میں یہ قلمی تصنیف محفوظ ہے) میں دوسری طرح ہیں۔ جناب قاضی عبدالودود نے ان دونوں میں جو اشعار مختلف طور پر ہیں۔ پر بحث کرتے ہوئے آخر کار لکھا [2]

"——— غالب سے یہ ناممکن نہیں کہ انہوں نے مثنوی دو شکلوں میں کلکتہ ہی میں لکھی ہو، ایک شکل جسے میں نے روایت اولین کہا ہے، اہل کلکتہ کے لئے اور دوسری باہر والوں کے واسطے۔"

---

[1] تجلیات شعرستانِ فارسی۔ از سید لطیف الرحمٰن۔ [2] مجموعہ دہلی اور غالب قاضی عبدالودود سہ ماہی "اردو غالب نمبر کراچی ۱۹۶۹ء"

قاطعِ بُرہان اور بنگال

غالب کی زندگی کا دوسرا اور آخری ادبی ہنگامہ "قاطعِ برہان" کی اشاعت کے فوراً بعد شروع ہوا۔ غدر کے دنوں جب دہلی کے باشندوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور غالب خانہ نشیں ہو کر رہ جانے پر مجبور ہوئے۔ ان دنوں ان کا زیادہ تر وقت گھر کی چہار دیواری میں تنہائی میں گذرا۔ کچھ عرصہ تو وہ "دستنبو" کی ترتیب میں لگے رہے۔ لیکن جب یہ کام پورا ہو گیا تو ان کے پاس کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا۔ ان دنوں ان کے پاس محمد حسین برہان، ابن تبریزی کی مشہور و ضخیم فارسی فرہنگ "برہان قاطع" کی ایک جلد تھی جس کا وہ وقت گذارنے کے لئے مطالعہ کرتے رہے۔ اور بقول غالب اس میں ان کو جو جو اغلاط ملے جا بجا حاشیہ پر نوٹ لکھتے ہوئے درست کرتے رہے اور بعد میں اسی کو "قاطع برہان" کے نام پر ترتیب دے دیا گیا۔

______ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء نولکشور پریس سے
قاطع برہان" شائع ہوا اور ساتھ ہی غالب کی زندگی کا دوسرا ادبی
ہنگامہ بھی شروع ہوا۔ جس ادبی ہنگامے کا ذکر غالب نے کئی خطوط
میں کیا ہے۔ "قاطع برہان" کی تردید میں کلکتہ سے مولوی آغا احمد علی
جہانگیر نگری نے قلم اٹھائی اور "موید برہان" لکھی جو ۱۲۸۲ھ میں
چھپی یہ قاطع برہان کی تردید میں حالانکہ چوتھی کتاب رہی ہے۔ لیکن
یہی سب سے ضخیم اور مبسوط کتاب تسلیم کی گئی۔ جس کے صفحات ۴۶۸ ہیں یا
اس لحاظ سے دیگر تصانیف محض کتابچے ہی کہے جانے کے قابل ہیں "موید
برہان" کو دیکھنے سے قبل ہی محض کسی سے یہ سن کر کہ کسی نے ان کے خلاف
ایک کتاب "موید برہان" لکھی ہے۔ غالب نے ایک فارسی قطعہ لکھا تھا۔
غالب اس سلسلے میں ۱۶ شعبان ۱۲۸۳ھ کو ایک خط میں ذکا کے نام لکھتے
ہیں:[1]

______ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع
دی کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ نے ایک رسالہ
لکھا ہے نام اس کا موید برہان ہے۔ اس رسالہ میں دفاع
کئے ہیں۔ تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کئے ہیں اور تیری
تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کئے ہیں اور اہل مدرسہ اور

---

[1] مکمل اردوئے معلی۔ ص ۲۲

شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم کی لکھی ہیں۔؎

——— ۱۸۶۷ء میں پہلی بار انھوں نے "موید برہان" دیکھی جس کا ذکر بھی غالب نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

——— "موید برہان" میرے پاس بھی آگئی ہے اور میں اس کی خرافات کا حال بہ قید بہ شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں وہ تمھارے پاس بھیجوں گا۔ بشرط مودت بشرط آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب ضرور دو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب سمجھو درج کردو۔"

——— لیکن میر حبیب اللہ ذکا نے جواب لکھنا منظور نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے خود غالب نے یہ کام اپنے ذمہ لیا اور موید برہان کے جواب میں اردو میں "تیغ تیز" نامی ایک مختصر رسالہ لکھا جو اکمل المطابع سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کا سال تصنیف ۱۸۶۷ء ہے۔ مولوی احمد علی نے "تیغ تیز" کا جواب اپنے ایک شاگرد عبدالصمد فدا سلہٹی سے "تیغ تیز تر" کے نام سے دلوایا۔ پھر "تیغ تیز تر" کا جواب غالب کے شاگردوں میں سے محمد باقر علی باقر آروی اور خواجہ سید فخرالدین حسین سخن دہلوی نے چار قطعے لکھ کر دیا۔ یہ قطعہ بھی اسی زمین میں ہے

۱؎ عود ہندی خط نمبر ۲۵

گئے ہیں ۔ ان دونوں قطعوں کا جواب بھی فدا سلہٹی کی طرف سے دیا گیا ۔ اسی طرح اس میں غالب کا قطعہ، اُسی زمین میں فدا کا جواب اور پھر جواب الجواب سب کچھ شامل ہے یہ ۱۸۶۸ء میں مولوی غلام نبی خان کے مطبع نبوی میں عبداللہ خان کے زیر اہتمام چھپا ہے ۔ لیکن یہیں یہ جنگ ختم نہیں ہوئی ۔ منشی جواہر سنگھ جوہر لکھنوی نے مولوی احمد علی کی حمایت اور غالب کی مخالفت میں ایک قطعہ کہا ۔ اس قطعہ کا اور فدا سلہٹی کے قطعہ کا جواب باقر اور سخن نے دیا ۔ یعنی تیغ تیز تر کا جواب " ہنگامہ دلِ آشوب " یا درفش کاویانی " کی شکل میں غالب کے طرفداروں نے یعنی باقر اور سخن کی طرف سے نکلا ۔ اس کا جواب شمشیر تیز تر کے نام سے احمد علی کی طرف سے پیش کیا گیا ۔ غالباً یہ سلسلہ ایک عرصے تک اور بھی چلتا رہا ۔ لیکن " شمشیر تیز تر " کی اشاعت کے فوراً بعد غالب کا انتقال ہوگیا اور " قاطع برہان " کا یہ ہنگامہ بھی دب کر رہ گیا ۔

—— غالب جانتے تھے کہ قاطع برہان " پر کافی لے دے ہوگی میر مہدی مجروح کو انہوں نے ایک خط میں لکھا ——

" —— مگر یہ یاد رہے کہ جو صاحب اس کو دیکھیں گے (یعنی قاطع برہان کو) ہرگز نہ سمجھیں گے صرف برہان قاطع کے نام پر جان دیں گے ۔ کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا ۔ پہلے تو عالم ہو ۔ دوسرے فن لغت کو جانتا ہو ۔ تیسرے فارسی

کا علم ہو اور زبان سے اسے لگاؤ ہو۔ اساتذہ سلف کا کلام بھی بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو۔ چوتھے منصف ہو۔ ہٹ دھرم نہ ہو۔ پانچویں طبع سلیم اور ذہن مستقیم رکھتا ہو۔ مفلوج الذہن اور کج فہم نہ ہو۔ تو یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی اور نہ کوئی میری محنت کی داد دے گا۔"

پانچوں باتیں مکمل طور پر ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب کے معترضین میں (سید سعادت علی۔ مولوی نجف علی خان۔ رحیم بیگ میرٹھی اور مولوی امین الدین وغیرہ) سب سے ٹھوس کتاب آغا احمد علی کی "موید برہان" کو ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

جیسا کہ کہا گیا ہے غالب نے موید برہان کا جواب تیغ تیز سے دیا۔ اسی تیغ تیز پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے[۱]۔

"(غالب نے) احمد کے محض چند اعتراضات سے بحث کی ہے۔ اور وہ بھی تشفی بخش نہیں۔ مزید یہ کہ کتاب میں متعدد مقامات پر صریحاً خلاف واقعہ باتیں لکھی ہیں یا غالب نے احمد کو رابعہم۔ جو کہا ہے وہ صحیح نہیں۔ موید کے بیچ کے متعلق غالب کی شکایات بجا ہیں۔۔۔۔ موید

---

(۱) ماثر غالب۔ قاضی عبدالودود ص ۳۳

بہترین کتاب ہے جو قاطع کے جواب میں لکھی گئی تھی اگر اس کا لہجہ معتدل ہوتا اور جا بجا طول بے جا سے کام نہ لیا جاتا۔ تو اور بہتر ہوتی۔ احمد نے تیغ کے جواب میں "شمشیر تیز تر تحریر کی .... اس کا لہجہ موید سے بہتر ہے۔"

_____ غالب کی آرزو کہ ان کو ہندستان میں فارسی کا عالم بے بدل تسلیم کر لیا جائے " قاطع برہان " لکھ کر بھی پورا نہ ہوا۔ اس سلسلے میں نیر مسعود نے بجا لکھا ہے کہ:

_____ " فارسی دانی کے میدان میں غالب خود کو جس شہرت کا مستحق سمجھتے تھے وہ انہیں حاصل نہ تھی قتیل والے معرکہ کا انجام غالب کے حسب منشا نہیں ہوا تھا ان کا یہ خیال کہ ان کے سامنے قتیل اور ہندستان کے دوسرے فارسی داں بے وقعت ہیں۔ عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا اور اس حیثیت سے غالب اب بھی کنج خمول و گمنامی ہی میں پڑے تھے۔ جس سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا انہوں نے ضروری سمجھا۔ اسی کوشش کا ایک نام قاطع برہان ہے۔ محمد حسین برہان یقیناً دنیائے فارسی کا ایک سربرآوردہ اور ممتاز شخص تھا۔ یہ حیثیت اسے اپنی تالیف " برہان قاطع " کی بدولت حاصل تھی۔ اس برہان قاطع کو رد کرنا اور اس

کے مولف کی تحقیر کرنا فوری شہرت کے حصول کا ضامن تھا غالب کے ساتھ نا انصافی نہ ہوگی اگر یہ سمجھا جائے کہ برہان قاطع کی رد لکھ کر وہ شہرت پانا اور اپنی حیثیت منوانا چاہتے تھے۔"

غالبؔ اور ہوگلی

—— مرزا غالب نے کلکتہ کے علاوہ بنگال کے جس شہر کو قریب سے دیکھا ہے وہ ہوگلی ہے۔ کلکتہ اور ہگلی میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ کلکتہ انگریزی تہذیب اور نئے تمدن کا جلوہ گاہ تھا۔ تو ہگلی بنگال کی قدیم تہذیب کا مینار۔ یقیناً غالب نے ان دونوں شہروں کے اس فرق کو محسوس کیا ہوگا۔ لیکن ہوگلی سے غالب زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ کیونکہ غالب ہندستان کی قدیم تہذیب ہی کا ایک نمائندہ تھے اور ہندستان کی مسلم تہذیب

کا ایک قدیم شہر دہلی کے باشندے تھے لہٰذا ہگلی میں جب ان کو اپنی جانی پہچانی تہذیب کی پرچھائیاں نظر آئیں تو ان کی آنکھیں چکاچوندھ نہیں ہوئیں ۔ لیکن کلکتے میں ایک نیا سماج ابھر رہا تھا لہٰذا غالب کے لیے اس کی اہمیت تھی ۔

ضلع ہگلی کو بنگال کی تاریخ میں "مسلم تہذیب و تمدن کا عجائب گھر" کہا گیا ہے ۔ ہگلی کی اہمیت مرشد آباد سے بہت قبل بھی تھی ۔ حتیٰ کہ "آئین اکبری" میں بھی شہر ہگلی کا ذکر موجود ہے ۔ فرنگیوں میں یہاں سب سے قبل پرتگالی آئے ۔ لیکن یہ پرتگالی یہاں کب آئے ۔ کے سلسلے میں اختلافات ہیں ۔ چند تاریخ داں ۱۵۳۷ء لکھتے ہیں تو چند ۱۵۷۸ء ۔ عیسائیوں کا سب سے قدیم گرجا گھر اسی ہگلی شہر کے قریب بمقام "بنڈل" دریائے بھاگرتھی (یعنی دریائے ہگلی) کے کنارے ہے ۔ جس کی تعمیر ۱۵۹۹ء میں ہوئی اور جسے ہندستان کا سب سے قدیم گرجا گھر کہا جاتا ہے ۔ یہ قدیم گرجا گھر اور پھر ہگلی کا مشہور امام باڑہ ہگلی کی شہرت کے لیے کافی ہے ۔ ہگلی کی تاریخ پر بنگلہ اور انگریزی زبانوں میں کئی قابل ذکر تصانیف موجود ہیں ۔ سدھیر کمار مترا ۔ بدھوشیکھر بھٹاچاریہ اور اے سی گپتا کی بنگلہ تصانیف کے علاوہ ذیل کی انگریزی کتابیں اس سلسلے میں اہم ہیں ۔

1 A STATISTICAL ACCOUNT OF BENGAL – BY. W. W. HUNTER 1874

(2) HOOGHLY– PAST & PRESENT – BY SHUMBHOO CH. DEY 1906
(3) A BRIEF HISTORY OF HUGHLY DISTRICT – By D. G. CRAWFORD 1902

———— اُن دنوں جب مرزا نے بنگال کا سفر کیا کلکتہ سے ہگلی جانے کے لئے نہ ریل تھی اور نہ کوئی بہتر سڑک۔ عموماً یہ سفر دریائے ہگلی میں کشتی پر کیا جاتا تھا۔ غالب نے کلکتہ پہنچنے کا جو ذکر کیا ہے اس سے ہمیں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عظیم آباد سے ہو کر وہ ہگلی پہنچے تھے۔ جہاں سے وہ کلکتہ آئے۔ لیکن کس دن وہ پہلی بار ہگلی پہنچے تھے۔ کا علم نہیں ہوتا۔ یہاں کلکتہ آنے کے بعد وہ کلکتہ سے ہگلی کئی بار گئے ہیں۔ دریائی راستے سے شہر ہگلی۔ کلکتہ سے لگ بھگ ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے اور کوئی پانچ گھنٹوں کا سفر ہے۔ غالب کو بھی کلکتہ سے ہگلی یا ہگلی سے کلکتہ آنے جانے میں اتنا ہی وقت لگا ہوگا۔ اور راستے میں انہوں نے بالی، اترپارہ، سری رامپور، بنڈل۔ پانڈوا۔ چندن نگر وغیرہ مقامات دیکھے ہوں گے۔ چونکہ ان مقامات کا وجود عہد غالب میں بھی رہا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا زیادتی نہیں ہے کہ چند گھنٹوں کے لئے ہی کیوں نہ غالب ان مقامات پر رکے ہوں گے یا اگر رکے نہیں تب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے نظریں بھر بھر کر ان مقامات کے قابل دید تاریخی اہمیت کی عمارتوں اور میناروں کو دیکھا ہے کیونکہ یہ تمام تاریخی عمارتیں لب دریا پر واقع ہیں اور کشتی میں سفر کرتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔

______ غالب کے مختلف خطوط میں ان کے ہگلی جانے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ہگلی میں ان کے کرم فرما نواب اکبر علی خان طباطبائی رہتے تھے۔ جن کے نام غالب کے چند فارسی خطوط بھی ہیں۔ علی اکبر خان ان دنوں امام باڑہ ہگلی کے متولی بھی تھے غالب ان کے پاس محمد علی خاں (صدر امین باندہ) اور سراج الدین علی خان (محمد علی خان باندہ کے بھائی) کے سفارشی خطوط لے کر ملنے گئے تھے۔ غالب کے مختلف خطوط سے تین بار ان کے ہگلی جانے کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی بار وہ کب گئے، کی صحیح تاریخ کا علم نہیں لیکن یہ غالب کے کلکتہ پہونچنے کے دو چار دنوں بعد ہی کا واقعہ ہوگا۔ چونکہ محمد علی خان کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے۔

"______ ۱۹ رشعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا' اور وہاں سے کلکتہ پہونچا ...... آپ کا خط ہگلی لے کر گیا [1]"

______ پہلی بار جب وہ ہگلی گئے، تو وہاں رکے نہیں بلکہ علی اکبر خان سے ملاقات کے بعد کلکتہ لوٹ آئے۔ دوسری بار جب غالب ہگلی گئے، تو وہاں وہ پانچ دنوں تک علی اکبر خان کے مہمان رہے۔ غالب لکھتے ہیں [2]

---

[1] مجموعہ دہلی اور غالب۔ قاضی عبدالودود رسالہ اردو۔ غالب نمبر کراچی ۱۹۶۹ء
[2] " " " " " " " "

"______ نواب سید علی اکبر خان بہادر کو کاروبار شادی سے فراغت ہوئی۔ دربار میں حاضر نہ تھے۔ اس لئے میں نے خط لکھا ...... جواب آیا کہ طبیعت ناساز ہے میں عیادت کو گیا۔ انہیں عارضہ ریگ گردہ تھا۔ ظاہر مادہ کم تھا۔ جلد صحت ہو گئی۔ کامل پانچ دن وہاں گذار کر گھر واپس آیا۔"

______ محمد علی خان کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ نواب اکبر علی خان کی [۱]

"______ چھوٹی بیٹی کی شادی در پیش ہے۔ مجھ سے فرما گئے ہیں کہ میں طلب کروں تو ایک ہفتہ کے لئے میرے یہاں آکر رہو۔ اس کا منتظر ہوں۔ ظاہراً ابھی تاریخ مقرر نہیں ہوئی ہے۔"

______ لیکن غالب کے دیگر کسی خط سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شادی کب انجام پائی اور شادی کے موقع پر غالب کتنے دنوں تک ہگلی میں رہے۔ بہرحال غالب خود اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ تین بار ہگلی گئے تھے۔ ملاحظہ ہو [۲]

"______ علی اکبر خان ہگلی میں ہیں۔ تین بار وہاں

---

[۱] مجموعہ دہلی اور غالب۔ قاضی عبدالودود۔ رسالہ "اردو" غالب نمبر کراچی سنہ ۱۹۶۹ء

[۲] " " " " " " " "

گیا ہوں اور وہ بھی ایک بار جب کلکتے آئے تھے تو میرے یہاں تشریف لائے تھے۔"

______ آج کل "ہگلی" امام باڑہ اور محسن کالج کے لیے مشہور ہے لیکن یہ دونوں عمارتیں عہد غالب میں نہیں تھیں صرف ایک چھوٹا سا امام باڑہ تھا جسے اب پرانا امام باڑہ کہتے ہیں۔ اس پرانے امام باڑہ ہی میں علی اکبر خان رہا کرتے تھے۔ نیا امام باڑہ جو سڑک کے دوسری جانب لب دریا واقع ہے۔ مولوی کرامت علی جون پوری کے عہد متولی کے زمانے میں بنا اور ایک اندازے کے مطابق اس کی تعمیر پر ان دنوں پونے تین لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ یہ نیا امام باڑہ نہایت عالیشان اور حسین عمارت ہے جس کا فرش سنگ مرمر کا ہے اور دیواروں پر قرآن پاک کی آیات منقش ہیں۔ لیکن جب غالب ہگلی گئے، ان دنوں مولوی کرامت علی جون پوری متولی نہیں تھے بلکہ علی اکبر خان تھے "اردوئے معلیٰ" میں غالب کا ایک خط مولوی کرامت علی کے نام ہے غالباً یہ ہگلی والے ہی ہیں۔ لیکن اس خط سے یہ بات واضح نہیں ہوتی ہے۔

______ ہگلی کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں ایک اور وجہ سے بھی کیا ہے۔ غالب کو آم بے حد پسند تھے اور انبہٴ بنگالہ کی انہوں نے دل کھول کر تعریف کی ہے۔ غالب نے ہگلی کے آم خوب کھائے ہیں اور نواب اکبر علی خان ان کو اکثر آم

کھانے کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ ایک خط میں غالب نے لکھا ہے :[۱]

"______ نواب علی اکبر خان بہادر کشاکش حکام سے فارغ ہیں اور اغلب و اکثر آم بھیجتے رہے ہیں۔"

بنگال میں غالب کے شاگرد، ہمعصر، معتقدین اور مخالفین

______ غالب تقریباً دو سال تک کلکتہ میں رہے ظاہر ہے کئی لوگوں سے یہاں ان کی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان میں سے چند کو ان کا شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ کئی نامور ادیب شاعر اور صاحب علم حضرات سے ان کی دوستی ہوئی اور چند ان

۱: مجموعہ دہلی اور غالب "قاضی عبدالودود" رسالہ "اردو" غالب نمبر کراچی ۶۹

کے مخالفین یا دشمن بھی بنے۔ کئی ہمعصر کا نام ہمیں غالب کے کلام و خطوط میں ملتے ہیں۔ ذیل میں ایسے حضرات کا ذکر کرتا ہوں جو غالب کے ہمعصر تھے۔ ان کے شاگرد۔ دوست یا دشمن تھے۔

(۱) احمد علی ـــــ آغا احمد علی اصفہانی

بیشتر نے آپ کا نام آغا احمد علی اور بعض نے آقا احمد علی لکھا ہے۔ لفظ "آغا" کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ:

ـــــ مولوی احمد علی ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے تھے۔ آپ ایک بلند پایہ انشاپرداز و شاعر تھے۔ اور احمد تخلص فرماتے تھے۔ شعر گوئی کے سلسلے میں آپ اسد اللہ کوکب کے دامن فیض سے وابستہ رہے آپ کے آبا و اجداد نادر شاہ درانی کے ساتھ ایران سے آئے تھے۔ دادا آغا عبدالعلی اپنے عہد میں خوش نویس خطاط کے طور پر مشہور ہوئے اور ڈھاکہ میں آبسے یہیں آپ کے والد شجاعت علی جن کا تاریخی نام مظہر علی تھا۔ نے اپنی زندگی گذاری اور احمد علی بھی ڈھاکہ میں (۱۸۲۹ء) پیدا ہوئے۔ ناسخ سے آپ کی ملاقات تھی جس کا ذکر ناسخ نے اپنی سوانح عمری (قلمی) میں کیا ہے ۱۸۶۲ء میں آپ کلکتہ چلے آئے اور یہاں ایک مدرسہ

ــــــــــــــــ

؎ غالب اور ابوالکلام ۔ مرتبہ عتیق صدیقی

بنام "مدرسہ احمدیہ" قائم کیا۔ جس کے وہ آخر تک صدر رہے۔ ساتھ ہی آپ (۱۸۶۲ء) مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارسی کے معلم بھی تھے۔

مرزا غالب کی زندگی کا آخری معرکہ ان کی تصنیف "قاطع برہان" کی اشاعت سے شروع ہوا۔ جس کا تفصیلی ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔ مولوی احمد علی نے "قاطع برہان" کے خلاف سب سے ٹھوس اور مدلل کتاب لکھی جو ۱۸۶۶ء میں چھپی اور جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ

خواجہ را از اصفہانی آبا چہ سود

درخصوص گفتگوئے پارسی انشاء کردہ است

خالقش در کشور بنگالہ پیدا کردہ است

مولوی احمد علی کے اعتراضات ایسے تھے کہ غالب کو مجبوراً جواب دینا پڑا اور انہوں نے ایک رسالہ "تیغ تیز" کے نام سے اس کے جواب میں شائع کیا، اور ۳۱ اشعار کا ایک قطعہ بھی آغا احمد علی کے نام لکھ بھیجا۔ جس میں ان کی کتاب پر بڑے پُر اثر انداز میں نکتہ چینی کی ہے۔ جب آغا نے "موید برہان" لکھی تب وہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے معلم ہونے کے علاوہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے منسلک بھی تھے اور سوسائٹی کے مطبوعات فارسی۔ مرتب کرنے کا کام انجام دے

رہے تھے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے آپ نے منتخب التواریخ، اقبال نامہ جہانگیری، مآثر عالمگیری اور اکبر نامہ کے بعض اجزاء تصحیح کر کے اشاعت کے لیے مرتب کیا۔

مولوی صاحب کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے جن میں بنگال کے کئی نامور شعرائے فارسی و اردو اور صاحب قلم ادیب و نقاد شامل ہیں۔ مثلاً نواب سید محمد آزاد، مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی، محمد اشرف، عبدالعلیم عاصم واصف اور مشہور انگریز بلاک مین وغیرہ۔ نساخ اور عبدی آپ کے ہمعصر اور دوست رہے ہیں۔

احمد علی کے دیگر تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شمشیر تیز تر:۔ یہ غالب کا جواب "تیغ تیز" کے جواب میں ۱۸۶۸ء میں لکھی گئی احمد علی کی یہ تصنیف فارسی میں ہے۔ تذکرہ "سدید برہان" اور "شمشیر تیز تر" کے ذکر کے بغیر یہ نامکمل ہے چونکہ یہ تمام تصانیف "قاطع برہان" کا جواب اور جواب الجواب ہے۔

(۲) اشتقاق:۔ ایک مختصر رسالہ ہے جس میں فارسی صرف و نحو پر بحث کی گئی ہے۔

(۳) ترانہ:۔ یہ بھی ایک مختصر رسالہ ہے جس میں فارسی رباعی

کی تاریخ اور اس کے اوزان ہیں اسے بلاک مَن نے
۱۸۶۷ء میں کلکتہ سے شائع کیا۔

(۴) ہفت آسمان :- احمد علی کی آخری تصنیف ہے۔ یہ فارسی
مثنوی کی تاریخ ہے۔ جس میں مثنوی کے سات اوزان
کی شرح کی گئی ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے دسمبر ۱۸۷۲ء
میں اس کا ایک باب "آسمان اول" کے نام سے شائع کیا۔
آپ کا انتقال جون ۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۰ھ بمقام ڈھاکہ
ہوا۔ نساخ نے تاریخ وفات کہی۔

"واصل حق آغا احمد"

احمد علی گوپاموی۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مشاعرے میں
غالبؔ کے کلام پر جن حضرات نے اعتراضات کئے ہیں ان میں سے
ایک ہیں۔ آپ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ لیکن بسلسلہ روزگار
کلکتہ میں آکر بس گئے اور یہاں وہ شہید ٹیپو سلطان کے فرزند
پرنس غلام محمد (اس خاندان کے افراد کو انگریزوں نے ٹالیگنج
کلکتہ بطور شاہی قیدی لاکر بسایا تھا) کے ہاں میر منشی کے عہدے
پر تھے آپ کا سب سے اہم اور غالباً واحد کارنامہ "حملات حیدری"
نامی تصنیف ہے۔ گارسان دتاسی نے اس کتاب کے سلسلے میں
[illegible] حیدر علی کی تاریخ ہے۔ جو شاہ

میسور کے بیٹے (پرنس غلام محمد) نے لکھی ہے ؎ یہ بیان غلط ہے اس کے مصنف پرنس غلام محمد نہیں بلکہ ان کی فرمائش پر ان کے میر منشی یعنی احمد علی گوپاموی نے فارسی تصنیف "کارنامہ حیدری" کا ترجمہ کیا اور کئی صفحات کا اضافہ بھی کیا۔ "حملات حیدری" نہ صرف حیدر علی کی تاریخ یا سوانح ہے بلکہ اس میں ہندستان کی جغرافیائی حدود۔ پہاڑ دریا اور ندیوں پر پر از معلومات بھی ہیں۔ اس کے صفحات ٧٥٢ ہیں۔

۲۔ اختر۔ خواجہ عبدالغفار :- آپ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں اور مشرقی بنگال میں تو آپ کو ایک کہنہ مشق استاد کا مقام حاصل رہا ہے۔ آپ جدید بنگال کے نامور شاعر و ادیب خواجہ احسن اللہ شاہین (انتقال دسمبر سنہ ١٩٠٢ء) کے ماموں ہوتے تھے۔ جناب شبیر علوی نے ایک مضمون میں لکھا ہے ؎ ـــ مرزا غالب کی پیری میں اختر کی شاعری جوان تھی اور ایسی زمانے میں انہوں نے ایک غزل کہی جس کا مقطع تھا۔

داد غالب بھی تجھے دیں گے زباندانی کی
لے کے اختر جو یہ دلی میں غزل جائے گا

؎ مضمون "خواجہ احسن اللہ شاہین" روزنامہ "پاسبان" ڈھاکہ مورخہ ٢٥ دسمبر ١٩٦٢ء

عبد الغفار کی یہی غزل غالبؔ سے اکتساب فیض کی تمہید بن گئی اور اس مقطع کی بدولت انہیں مرزا غالبؔ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا جس پر انہیں اپنی تمام عمر بجا طور پر ناز تھا ۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی ؔ[۱] نے بھی مذکورہ شعر کو پیش کرتے ہوئے آپ کو شاگرد غالبؔ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا کہ اخترؔ کا ایک اور تخلص زنانہؔ تھا ۔ جس کا استعمال وہ صرف ریختی میں کیا کرتے تھے ۔ نساخؔ نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے[۲] "متوطن کشمیر مولد و مسکن ڈھاکہ" لکھا اور ان کا شمار اپنے دوستوں میں کیا ہے ۔

۴ ارمانؔ ۔ راجا جنمے جے مترا آپ کی مکمل سوانح حیات اور ادبی خدمات پر اردو میں راقم الحروف ہی نے سب سے قبل قلم اٹھایا اور ان کا بھرپور ذکر "بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات" میں کی ہے ۔ آپ عہد غالبؔ میں بنگال کے ایک بلند پایہ شاعر تھے ۔ غالبؔ سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں کا علم نہیں لیکن آپ ان کے ہمعصر شعرائے بنگالہ میں ممتاز رہے ہیں ۔ ارمانؔ کا مشہور ادبی کارنامہ ان کا تذکرہ شعراء "نسخہ دلکشا" ہے جو غالبؔ کی زندگی ہی میں انہوں نے مکمل کر لیا تھا

۱؎ "مشرقی پاکستان کے اردو ادیب" اور ڈاکٹر عندلیب شادانی بحوالہ "بنگال میں اردو" از وفا راشدی

۲؎ "سخن شعراء" ۔ از عبد الغفور نساخؔ ۔

لیکن جب ارمان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے راجندر لال مترا نے ۱۸۷۰ء میں کلکتے سے چھاپ کر شائع کیا۔ اس تذکرہ کا دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا۔ بلکہ اس دوسرے حصے کو راجندر لال مترا نے مشہور فرانسیسی عالم گارساں دتاسی کو روانہ کر دیا تھا۔ جس کا ذکر دتاسی نے اپنے خطبات میں کیا ہے۔ تذکرہ میں غالب کا ذکر اسد اور غالب دونوں تخلص کے تحت ہی کیا گیا ہے[1]۔ اس تذکرے میں "چکنی ڈلی" پر قطعہ کے علاوہ غالب کے دیگر ۲۷ اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کیے گئے ہیں۔

غالب نے "چکنی ڈلی" کی مدح میں جو اشعار کہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک خط میں حاتم علی مہر کو لکھا[2]: "مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے (کلکتے میں) دوست تھے انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو۔ دس شعر کا قطعہ کہہ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی اس سے لی۔ اب سوچ رہا ہوں، جو شعر یاد آتے جاتے ہیں لکھتا ہوں .... غرض کہ بیس بائیس[؟] پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ آخر کی بیت

---

[1] دیکھیے "نسخۂ دلکشا" از جنمے جے مترا ارمان

[2] خطوط غالب۔ مرتبہ غلام رسول مہر حصہ اول خط نمبر ۱۵۱ نیز عود ہندی خط نمبر ۹۷

یہ ہے:

اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجے، فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے۔"

غالب کا یہ قطعہ ان کے دیوان میں بھی شامل ہے۔ "مرقع غالب" میں پرتھوی چند نے اسے "در مدح ڈلی" کے عنوان سے شامل کیا ہے اور مالک رام نے بھی ان کے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب میں یہی عنوان دیا ہے۔ لیکن غالب نے مذکورہ خط میں اسے صرف "قطعہ" لکھا اور "نسخہ دلکشا" میں ارمان نے اسے "قطعہ" کہہ کر ہی شامل کیا ہے۔ جیسا کہ غالب نے اپنے مذکورہ خط میں لکھا ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ اشعار کو جوں کا توں برسوں یاد رکھیں۔ غالب نے قطعہ میں ۹-۱۰ شعر ہوں گے۔ کہا ہے۔ لیکن "نسخہ دلکشا" اور دیوان غالب کے تمام مشہور ایڈیشنوں میں تعداد اشعار ۱۳ ہیں۔ غالب نے خط میں جو اشعار نقل کیے ہیں وہ اس قطعہ کے نمبر ۱، ۲، ۳، ۶، ۷، ۹، ۴، اور آخری یعنی تیرواں شعر ہے۔ لیکن چوتھے شعر "مسی آلودہ" کے مصرعہ اول کے ساتھ غالب نے پانچویں شعر کا مصرعہ ثانی جوڑ ڈالا ہے۔ اس چوتھے شعر کا ثانی مصرعہ ارمان کے مطابق "داغ ہجر جگر عاشق شیدا کہیے" ہوگا۔ لیکن پرتھوی چند اور مالک رام وغیرہ نے دیوان غالب میں "داغ ہجر جگر" کے بجائے "داغ طرف جگر" کو درست قرار دیا ہے۔ غالب کے خط کے مطابق آخری بیت کا پہلا مصرعہ

یوں ہے۔

اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجیے، فرض

ارمان نے "نسخہ" "دل کشا" میں "اپنے حضرت کے" بجائے "بندہ پرور" کے" لکھا ہے اور مالک رام و پرتھوی چند وغیرہ نے بھی "بندہ پرور" کو ترجیح دی ہے

(۵) **آزاد** - سید محمود آزاد جناب مالک رام صاحب رقمطراز ہیں "ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اردو[۲]) کے مصنف نے سید محمود آزاد کو غالب کا شاگرد لکھا ہے یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کسی تذکرہ نویس نے آج تک اس کا ذکر نہیں کیا ہے"[۱] لیکن مالک رام کا یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا۔ چونکہ سید اقبال عظیم مصنف "مشرقی بنگال میں اردو" کے علاوہ دیگر چند اہل بنگال نے بھی آزاد کو غالب کا شاگرد ہی لکھا ہے۔ مثلاً وفا راشدی لکھتے ہیں:— مرزا غالب سے آزاد کے تعلقات خاص تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ غالب کے شاگرد بھی تھے چنانچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے پی ایچ ڈی۔ (لندن)، اپنے ایک مقالہ "مشرقی پاکستان کے اردو ادیب" میں

---

[۱] تلامذۂ غالب۔ از مالک رام

[۲] بنگال میں اردو - از وفا راشدی۔

رقمطراز ہیں۔ شرف صاحب (سید شرف الحسینی شرف مصنف گلستان شرفا محمود آزاد کے بھانجے ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ کے یادگار سلف بزرگ اور باکمال شاعر ہیں) کا بیان ہے کہ آزاد، مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ آزاد کا یہ دستور تھا کہ تقریباً ہر سال وہ دہلی جاتے تھے۔ اور دو تین مہینے وہاں قیام کرتے تھے اور اسی سفر کی غایت مرزا غالب سے ملاقات اور ان کی صحبت سے استفادہ ہوتی تھی۔ جبتک مرزا غالب زندہ رہے آزاد برابر دہلی جاتے رہے۔ حکیم محمود علیخان دہلوی۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ۔ مجروح اور حالی سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ ان بزرگوں سے تعلقات خاص تھے۔ جس زمانے میں مرزا غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ آئے ہوئے تھے آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔ غرض مرزا غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ آئے ہوئے تھے آزاد بھی ان سے ملنے کلکتہ گئے تھے۔ غرض مرزا غالب کے ساتھ وہ غیر معمولی دلچسپی اور ارادت رکھتے تھے۔"

سید لطیف الرحمٰن صاحب معلم مدرسہ عالیہ کلکتہ نے آزاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " آزاد نے ضیغم کے علاوہ مرزا اسد اللہ خان غالب سے بھی اصلاحیں لی تھیں۔ جب مرزا غالب اپنے مقدمہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے تو آزاد بھی کلکتہ میں تھے۔ غالب سے ملاقات کیا ہوئی زندگی بھر کے لیے غالب کے ہو رہے اور غالب ہی کو اپنا استاد بتانے لگے۔ بذریعہ خطوط اصلاح سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ آزاد اور غالب کے تعلقات اس حد تک بڑھے کہ آزاد اکثر دہلی جاتے چند ماہ قیام کرتے اور مرزا غالب کی صحبت سے فیضیاب ہوتے۔" سید لطیف الرحمٰن نے اپنے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے کتاب کے آخر میں لکھا ہے۔" آزاد کی زندگی کے

حالات و واقعات آزادؔ کے چھوٹے بھائی نواب سید محمد کے نبیرہ جناب سید اختر حسین صاحب سے دستیاب ہوئے۔" پروفیسر جاوید نہال نے بھی آزادؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "وہ اردو کے بھی شاعر تھے اور غالبؔ سے اصلاح لی تھی۔"٭

نواب سید محمود آزاد (نواب سید محمد آزاد کے حقیقی بھائی) بنگال کے نامور فارسی اور اردو شاعر تھے۔ لیکن آزاد نے بقول خود اُردو شاعری کی طرف بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ آپ کے کلام کا ایک مجموعہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ آزادؔ کی زندگی اور کلام پر مفصل روشنی ڈالنا یہاں غیر ضروری ہے۔ چونکہ جناب وفا راشدی، سید لطیف الرحمٰن اور جاوید نہال وغیرہ نے ان کی زندگی اور کلام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

یہ درست ہے کہ آج تک مرزا غالبؔ کے جتنے خطوط (فارسی و اردو) منظر عام پر آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی آزادؔ کے نام نہیں ہے اور نہ ہی کسی خط میں آزادؔ کا ذکر ہے۔ اسی وجہ سے آزادؔ کے شاگرد غالبؔ ہونے میں یا ان سے تعلقات کے سلسلے میں شک و شبہ کی گنجائش رہ گئی ہے۔ لیکن جب تک کوئی ٹھوس بات سامنے نہ آئے

٭ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب۔ از پروفیسر جاوید نہال

تب تک بنگال کے ان اہل قلم حضرات ۔جن حضرات نے ان کو شاگرد غالب لکھا ہے کی مخالفت بھی بجا طور پر نہیں کی جاسکتی، حالانکہ ان حضرات نے بھی آزاد کے کسی خط یا کلام کا ذکر نہیں کیا ہے ۔جس سے یہ بات واضح ہوکہ آزاد واقعی غالب کے شاگرد تھے پھر بھی سید اختر حسن صاحب کی بات کو نہ تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

مرزا افضل بیگ ابن مرزا جیون بیگ

۶ افضل بیگ کلکتہ میں شاہ دہلی اکبر ثانی کی طرف سے وکیل تھے وہ غالب کی سگی بہن چھوٹی خانم کے شوہر اکبر بیگ کے بھائی تھے اور ان کی ہمشیرہ خواجہ حاجی سے بیاہی گئی تھی مرزا فرحت اللہ بیگ کے مطابق[۱] افضل بیگ کو مقرب الدولہ معز الملک دلاور جنگ کے خطابات حاصل تھے ۔ کلکتے میں افضل بیگ، غالب کے سخت ترین مخالف بنے اور جائداد کے مقدمہ میں مرزا کی ناکامی میں ان کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

مرزا افضل بیگ کا تذکرہ غالب کے کئی خطوط میں موجود ہے جن کے مطالعہ سے کلکتے میں افضل بیگ سے غالب کی ملاقات اور مقدمہ میں افضل بیگ کے حصے پر روشنی پڑتی ہے ۔ ایک خط

---

[۱] احوال غالب ۔ مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد صفحہ ۱۴۰

میں غالب نے لکھا ہے:[1] "افضل بیگ، یہاں وکیل اکبر شاہ ہیں۔ ان کی اور منشی عبدالکریم کی دوستی ہے بلکہ دونوں ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ افضل بیگ خواجہ حاجی کے سالے ہیں اور یہ وہ شخص ہے جسے احمد بخش خان نے میرے چچا کا رشتہ دار بتا کر میرا شریک قرار دیا تھا اور میرے مقدمے میں ایک درخواست یہ بھی ہے کہ اس کی شرکت غلط ہے ..... افضل بیگ نے ایک بات اور کی، شعراء میں شہرت دی کہ غالب، قتیل کو ناسزا کہتا ہے اور شعرائے کلکتہ کو نظر میں نہیں لگاتا۔"

جب مرزا غالب کلکتہ آئے۔ ان دنوں راجہ رام موہن رائے شہر کلکتہ ہی میں تھے اور غالب، راجا رام موہن رائے کی شخصیت سے بخوبی آگاہ تھے اور ان کی علمی، ادبی، سماجی و سیاسی سرگرمیوں سے مرعوب بھی تھے۔ لیکن غالب نے رام موہن رائے سے تعلقات قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس کی وجہ بھی مرزا افضل بیگ ہی رہے ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے[2] اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ یہ وہی زمانہ ہے جب مرزا افضل بیگ اس کوشش میں تھے کہ راجا رام موہن رائے کو بادشاہ دہلی کا سفیر بنا کر انگلستان روانہ کریں

---

[1] مجموعہ دہلی اور غالب۔ سہ ماہی اردو۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

[2] حیات غالب۔ شیخ محمد اکرام۔

اور اس سلسلہ میں مرزا افضل بیگ نے راجا رام موہن رائے سے اپنے تعلقات کو سنوارا تھا۔ غالب کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں راجہ رام موہن رائے کے متعلق یہ خبر گرم تھی کہ وہ گورنر کے پرائیوٹ کونسل کے رکن بن گئے ہیں۔ جس سے غالب کو بڑی فکر لاحق ہوگئی۔ غالب اس سلسلے میں رقمطراز ہیں[1]۔ "از جملہ اخبارات وحشت انگیز یکے این است کہ بعض ثقات میگویند کہ جناب نواب گورنر بہادر پرائیویٹ کونسلے قرار دادہ اند و رام موہن رائے یکے از اجزائے کونسل است" لہٰذا محض افضل بیگ کی وجہ سے غالب نے اپنے عہد کے سب سے نامور ہندستانی شخصیت راجا رام موہن رائے سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں کیا۔

انڈرو اسٹرلنگ انڈرو اسٹرلنگ، دفتر فارسی کلکتہ کے سکریٹری اور پولٹیکل ڈپارٹمنٹ کے نائب سکریٹری تھے اور جس زمانے میں غالب اپنی پنشن کی درخواست پیش کرنے کلکتہ آئے ان دنوں وہ چیف سکریٹری ہوگئے تھے۔ غالب نے کئی خطوط میں اسٹرلنگ کے حسن اخلاق کے گن گائے ہیں۔ بقول غالب وہ بڑی اچھی فارسی جانتے تھے اور سخن فہم تھے

---

[1] مجموعہ دہلی اور غالب۔ قاضی عبدالودود

عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے[1] کہ وہ ان کا حق دلانے پر "تیار ہو گئے تھے۔ لیکن غالب اپنی بد قسمتی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں — "بہ مرگ ناگاہ مر گئے۔"

مسٹر اسٹرلنگ سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے[2] "انڈرو اسٹرلنگ صاحب قوس عروجی کونسل کے لئے نقطہ ابتدائیت اور قوس نزولی کے لیے نقطہ نہایت ہیں۔ سنا ہے کہ سرمایہ علم و آگہی رکھتے ہیں۔ سخن فہم ہیں اور لطف سخن تک پہنچتے ہیں۔ میں نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا۔ جس میں کچھ اپنا حال بھی نظم کیا۔ اور اس کا کچھ حصہ سنایا، محظوظ ہوئے۔ اور دلجوئی کی۔" غالب نے ان کی مدح میں جو قصیدہ کہا تھا وہ کلیات غالب فارسی میں شامل ہے جس کے اشعار کی تعداد ۵۵ ہے۔ غالب کے ایک اور خط سے اس کا علم ہوتا ہے کہ جب مقدمہ کے کاغذات دہلی روانہ کر دینے کا حکم ہوا تب غالب نے اسٹرلنگ سے مشورہ کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔[3] "ارباب اربعہ کونسل نے دہلی جانے کا حکم دیا تو میں نے انڈرو اسٹرلنگ

---

[1] اردوئے معلی اور عود ہندی دونوں میں سرور کے نام یہ خط شامل ہے۔

[2] مجموعہ دہلی اور غالب سہ ماہی "اردو" کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

[3] مجموعہ دہلی اور غالب۔ سہ ماہی "اردو" کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

ے فریاد کی۔ جواب ملا کہ نہ جانا ہو تو نہ جاؤ۔ مقدمہ وہاں بھیج دو۔ مجھے تامل ہوا تو بولے کہ کیا سوچتے ہو۔ مقدمہ قابل سماعت ہے، کوئی وجہ نہیں کہ رزیڈنٹ نہ توجہ کریں۔ اس سے دل کو اطمینان ہوا"

غالب کے اس ہمدرد و غمگسار دوست کا انتقال ۲۳ مئی سنہ ۱۸۴۳ء میں ہوا اور غالب نے خود بھی ان کی وفات پر ایک قطعہ کہا ہے۔

۸ **توفیق**: شہزادہ بشیر الدین۔ "تلامذہ غالب" میں مالک رام نے آپ کا ذکر کیا ہے۔ آپ شہزادہ شکر اللہ سلطان کے صاحبزادے اور شہید ٹیپو سلطان والی میسور کے پوتے تھے اور ٹالی گنج کلکتہ کے باشندے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں کے نظم و نثر میں دستگاہ رکھتے تھے۔ بقول مالک رام۔ توفیق کے دیکھنے والے ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات برگزیدہ کی تعریف کرتے ہیں۔ چنانچہ دیوان ہزیر کی تقریظ و تاریخ اس پر گواہ ہیں۔

"اردوئے معلیٰ" میں غالب کے پانچ خطوط آپ کے نام ہیں جن کے مطالعے سے غالب سے آپ کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے حالانکہ آپ غالب کے شاگرد تھے لیکن اپنی عادت اور زمانے کی چلن کے مطابق غالب راجاؤں اور دیگر رئیسوں کو جس خوشامدانہ انداز میں خط لکھا کرتے تھے وہ [illegible]

کے خطوط بھی اسی طرح کے ہیں۔ نواب رامپور کے نام غالبؔ کے بیشتر خطوط میں ہم غالبؔ کا یہ مشہور شعر پاتے ہیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس شعر کا استعمال توفیقؔ کے نام ایک خط میں بھی غالبؔ نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ خطوط کا انداز بیان بھی ویسا ہی خوشامدانہ ہے جو غالبؔ کا رنگ عموماً صاحبِ ثروت کے نام لکھے ہوئے خطوط کا ہے بہت ممکن ہے کہ جب غالبؔ کلکتہ آئے تھے تب توفیق سے ان کی یہاں ملاقات رہی ہو۔ لیکن جو خطوط منظر عام پر آئے ہیں اس میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ ہاں توفیقؔ خط و کتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے ہیں اور توفیقؔ کے نام غالبؔ کے خطوط اسی سلسلہ کے ہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مشاعرے میں غالبؔ پر شعرائے کلکتہ (جن میں بیشتر قتیلؔ کے شاگرد تھے) کی نکتہ چینی کے بعد سے تا عمر غالبؔ۔ قتیلؔ کے خلاف نفرت پھیلاتے رہے ہیں اور اپنے شاگردوں۔ دوست احباب وغیرہ سب کے نام قتیلؔ کی برائیاں لکھتے رہے ہیں۔ توفیقؔ کے نام بھی انہوں نے ایسی باتیں قتیلؔ و واقف کے سلسلہ میں لکھا ہے مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں ـــــ

”فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسب طبیعت کو ہے۔ پھر تتبع کلام اہل زبان۔ لیکن یہ اشعار قتیلؔ و واقف

و شعرائے ہندستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایان نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی نہ معانی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متعدی نثر میں درج کرتے ہیں وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں۔"

غالبؔ کے اس شاگرد کا انتقال ۱۸۸۵ء بمقام کلکتہ ہوا۔ توفیقؔ کی آرامگاہ ٹیپو سلطان خاندان کا قبرستان۔ نزد کالی گھاٹ کلکتہ میں ہے لیکن چونکہ آج کل اس شاہی قبرستان کی حالت خراب ہے اور مختلف قبروں پر جو سنگ مرمر یا قیمتی پتھر وغیرہ تھے اور نام و تاریخ وفات وغیرہ درج تھے وہ سب اب نہیں ہیں۔ لہذا یہ کہنا ممکن نہیں کہ ان قبروں میں سے کون سی قبر کس شہزادے کی ہے۔

۹ **حسینؔ ۔ خورشید حسین** حسینؔ تخلص اور نام خورشید حسین تھا۔ تھے تو دہلوی لیکن عمر کا خاصا حصہ کلکتے میں گزارا اور یہیں شاعری کی ابتدا بھی غالباً ہوئی۔ سید حافظ اکرام احمد ضیغمؔ کے زمانے میں آپ کلکتہ میں تھے۔ جناب مالک رام نے آپ کا ذکر "تلامذہ غالب" میں کیا ہے۔

۱۰ **سخنؔ ۔ خواجہ فخرالدین حسین** :۔ خواجہ فخرالدین حسین سخنؔ

دہلوی۔ غالب کے ان چند شاگردوں میں سے رہے ہیں۔ جن پر غالب کو ناز تھا۔ ان کی یادگار "دیوان سخن" "سروش سخن" اور علم اخلاق کی ایک کتاب "تہذیب النفوس" نامی ہیں تہذیب النفوس، مجھے کہیں مل نہ سکی۔ باقی دونوں کتابیں میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں۔

مرزا غالب نے اپنے اس شاگرد کے کلام پر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے :[۱]

"سخنوروں کے ہزاروں دیوان دیکھے ہوں گے۔ اب سخن کا دیوان دیکھیں۔ زہے شاعر یکتا و نامی گر جس کا پیارا نام سخن ہے یعنی ہمہ تن سخن اور تمام سخن۔ قرۃ العین خواجہ سید محمد فخر الدین حسین کو اگر سخنور بے عدیل کہوں تو بجا ہے کیونکہ اس کا حسن کلام میرے دعوے پر دلیل اقویٰ ہے۔ اس سحر کار جادو نگار نے پری زادان معنی کو الفاظ کے شیشوں میں اس طرح اتارا ہے جیسے آبگینہ میں رنگ نظر آئے۔ لفظ سے جلوہ معنی آشکارا ہے۔ میں مغلوب دہر غالب نام جو بازار ہستی میں متاع کاسد ہوں۔ بحسب اصطلاح فقہا اس سید زادہ قدسی نہاد کا جد فاسد ہوں۔ چشم بد دور ہنوز آغاز جوانی اور نوبہار باغ زندگانی ہے۔ عمر

---

[۱] دیکھیے پیش لفظ "دیوان سخن" دہلوی مطبع منشی نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۶ء

کے لیے دفتر قضا و قدر ہی حکم دوام لکھا گیا ہے۔ پس اگر یہی جودت فکر اور طبیعت کی روانی ہے۔ اغلب کہ ذوق شعر اور شغل تحریر اشعار ہمیشہ چلا جائے گا۔ پھر تو یہ دیوان اوراق افلاک میں نہ سمائے گا۔"

بقول سخن جب تک وہ دہلی میں تھے خوب رہے لیکن اپنی قسمت آزمائی کے لئے ان کو دہلی سے نکل جانا پڑا۔ کچھ عرصہ وہ لکھنؤ میں رہے وہاں سے شاہ آباد (بہار) میں جا کر ملازمت و وکالت کرنے لگے۔ شاہ آباد سے سنہ ۱۸۶۱ء میں انہوں نے وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور اس کے بعد ہی ان کی زندگی کے دن پھرے اور باقی زندگی آرام و سکون سے گذری۔ یہی وہ زمانہ ہے جب وہ بہار و بنگال کے کئی مقامات پر مختلف مشاعروں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ کئی بار مشاعروں میں شرکت کے لئے کلکتہ آئے اور کئی کئی دن یہاں رہے۔ اور پھر عرصے تک کلکتہ میں آ کر مقیم ہو گئے۔

اردو کے کئی شعراء ایسے بھی گذرے ہیں۔ جن کو غالب نے کبھی بذریعہ خط محض کسی ایک دو غزل پر اصلاح دی تھی۔ جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو شاگرد غالب کہنے لگے۔ اور تاحیات ان کو اس کا فخر حاصل رہا۔ پھر غالب کے اس چہیتے شاگرد کو آخر اپنے استاد پر فخر کیوں نہ ہو۔ انہوں نے بھی۔ دیوان سخن۔ اور سروش سخن میں جگہ جگہ اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً

اس شہر میں غالب کا جو شاگرد سخن ہے

دشمن پہ ہمیشہ ہے وہ غالب ہے سخن میں

غالب کے ہو شاگرد سخن ۔ کہتے ہو کیا خوب
ہر شعر میں ملتا ہے مزا ایک ۔ غزل کا

"دیوان سخن" میں تین مخمس کے علاوہ غالب کی طرح پر کئی غزلیں اور غالب کے رنگ میں کئی اشعار موجود ہیں۔

مختلف مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے سخن نے اپنے عہد میں بنگال میں اپنا نام روشن کیا تھا اور یہاں کے ادبی حلقوں میں ان کی کافی عزت تھی۔ ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۸۹۹ء کو انہوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ ان کے ایک کلکتوی دوست جو شاعر و صحافی کے علاوہ مطبع گوہر آصفی کے مالک بھی تھے۔ یعنی محمد وزیر نے تاریخ وفات کہی ہے۔

سال رحلت آں وزیر دل حزیں
گفت ورد آہ فخر الدین حسین

سراج الدین احمد (مولوی)

کلکتہ میں جن لوگوں سے غالب کی ملاقات ہوئی تھی ان میں مولوی سراج الدین احمد کی شخصیت سب سے اہم ہے۔ جن کے حسن اخلاق اور دوستی سے، غالب بیحد متاثر ہوئے اور کئی خطوط میں غالب نے ان کا گلہ گلہ کیا ہے۔[۱]

مثلاً[۱] "ستّر برس کی عمر ہے بے مبالغہ کہتا ہوں ستّر ہزار آدمی نظر سے گذرے ہوں گے۔ زمرۂ خواص میں عوام کا شمار نہیں۔ دو شخص صادق الولا دیکھے۔ ایک مولوی سراج الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم لیکن وہ مرحوم حسن صورت نہیں رکھتا تھا۔ اور خلوص اخلاص اس کا میرے ساتھ تھا۔

مولوی سراج الدین احمد کے ایما پر ہی قیام کلکتہ کے دنوں غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب "گل رعنا" کے نام سے ترتیب دیا تھا۔ مرزا نے گل رعنا کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ انہوں نے پہلے پہل اردو زبان ہی میں شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن "گل رعنا" کے نام سے مرزا کے کلام کا انتخاب شائع نہیں ہوا۔ جناب مالک رام آج کل گل رعنا کو مرتب کرنے کا کام انجام دے رہے ہیں۔

"پنج آہنگ" کا چوتھا حصہ یعنی آہنگ چہارم میں "دیباچہ گل رعنا" اور خاتمہ گل رعنا "بھی شامل ہیں۔ جناب امتیاز علی عرشی نے بھی[۲] لکھا کہ "فارسی نظم کا کچھ حصہ "گل رعنا" کی شکل میں کلکتہ کے اندر ہی مرتب ہو چکا تھا مگر کلی دیوان فارسی دیباچہ دیوان اردو کے بیان کے مطابق سفر کلکتہ تک غیر مرتب مسودے

---

[۱] خط بنام خواجہ غلام غوث بیخبر

[۲] مقدمہ دیوان غالب فارسی۔ شاعر۔ بمبئی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

کی شکل میں تھا" حالانکہ ان دنوں "گل رعنا" شائع نہیں ہوا۔ لیکن سراج الدین احمد کی ایما پر غالب کا ایک انتخاب کو ترتیب دینا اس بات کی ضامن ہے کہ غالب کو سراج الدین احمد کی ادب دوستی اور خلوص پر کامل یقین تھا ورنہ وہ اس طرح گل رعنا کی ترتیب پر کمر نہیں باندھتے۔

سراج الدین احمد قصبہ موہان کے باشندے تھے اور کلکتے میں اپنی تجارت کی وجہ سے آکر بس گئے تھے کئی سال تک کلکتہ میں رہنے کے بعد بڑھاپے میں لکھنؤ چلے گئے۔ غالب کے فارسی خطوط میں سب سے زیادہ ان ہی کے نام لکھے گئے ہیں۔ مولوی سراج الدین نہ ادیب تھے اور نہ شاعر۔ لیکن وہ عربی۔ فارسی اور اردو بخوبی جانتے تھے اور کامل ادبی ذوق رکھنے کے علاوہ وہ شعراء کی قدر کرتے تھے۔ غالب کے قیام کلکتہ کے دنوں انہوں نے ہر طرح غالب کی مدد کی ہے۔

غالب نے اپنے کئی خطوط میں مولوی سراج الدین احمد کی مہربانیوں کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ ان کے خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ سراج الدین احمد کا حکام کلکتہ میں کافی رسوخ تھا اور کلکتہ کے مشہور اخبار "آئینہ سکندر" سے بھی ان کا تعلق تھا۔ لیکن کسی خط سے یہ علم نہیں ہوتا کہ کلکتہ میں سراج الدین احمد کا آخر کیا کاروبار تھا۔ یا حکام میں ان کا رسوخ آخر کس وجہ سے رہا ہے یا پھر "آئینہ سکندر" سے ان کا کیا تعلق تھا یہ درست ہے کہ "آئینہ سکندر" نامی ایک فارسی اخبار کلکتہ سے نکلا کرتا تھا۔ لیکن جب یہ اخبار جاری ہوا اس سے قبل ہی غالب

کلکتہ سے جا چکے تھے۔ چونکہ اس کا پہلا شمارہ ۷ مارچ ۱۸۳۱ء
کا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۸۳۶ء میں کلکتہ کے فارسی اخبارات
میں سلطان الاخبار کی ۲۷ کاپیاں۔ جام جہاں نما کی ۲۲ ۵۰ عالم افروز
کی ۱۵ کاپیاں اور آئینۂ سکندر کی ۵۲ کاپیاں ڈاک سے باہر جاتی تھیں
اس لحاظ سے آئینۂ سکندر سب سے مقبول اخبار رہا ہے۔[1]

بقول غالب حکام کلکتہ سے سراج الدین احمد کے گہرے تعلقات
تھے اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مولوی عبدالکریم سے ان کا رشتہ
تھا۔ غالب کے ایک خط سے اسی رشتہ کا علم ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں،[2]
کلکتے کا خط مولوی سراج الدین احمد برادر زادہ مولوی عبدالکریم کا
ہوگا۔ یہ اعیان دفتر خانہ فارسی میں خود بھی شامل ہیں۔ ۱۸۲۹ء سے
قبل سراج الدین احمد کلکتہ چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ چونکہ منشی
شیو نرائن کو غالب نے اس سلسلے میں لکھا ہے[3] ۔ اب ایک امر خاص
کو سمجھو۔ دو جلدیں دستنبو کی مجھ کو لکھنؤ بھیجنی ہیں اور میرے پاس
کوئی جلد نہیں ہے۔۔۔۔ ان دونوں صاحبوں کی خاطر مجھ کو بہت
عزیز ہے۔۔۔۔ دو پارسل الگ الگ لکھنؤ ارسال کرو۔

---

(۱) اخبار سماچار درپن۔ بنگلہ مورخہ ۱۷ اگست ۱۸۳۶ء

(۲) مجموعہ دہلی اور غالب۔ سہ ماہی اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

(۳) مکمل اردوئے معلیٰ۔ لاہور ایڈیشن ۱۹۳۰ء ص ۲۷۲، ۲۷۴

...... دوسرے پارسل پر بھی یہی عبارت ۔ گھر، مکان کا پتہ اور نام
اور در لکھنؤ بہ احاطہ خانساماں متصل تکیہ شیر علی شاہ بمکان مولوی
عبدالکریم مرحوم ۔ بخدمت مولوی سراج الدین احمد صاحب برسد ۔"

یہ خط جس کی تاریخ ۱۳ر جنوری ۱۸۵۹ء[۱] ہے میں غالب نے منشی
شیو نرائن کو خاص کر یہ لکھا " اور یاں صاحب ان دونوں پارسلوں
کی روانگی کی تاریخ مجھ کو لکھ بھیجو تاکہ میں اپنے خط میں ان کو اطلاع
دوں ۔ اس کے بعد مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۸۵۹ء کے خط میں بھی غالب
ان پارسلوں کا ذکر کرتے ہیں ۔

غالب کے فارسی خطوط میں کلکتہ کے ایک مشاعرے کا بھی ذکر
ہے جو کہ مولوی عبدالکریم کے رشتہ دار نے خاص طور پر غالب کے اعزاز
میں منعقد کیا تھا ۔ غالباً عبدالکریم کا یہ رشتہ دار جس کی طرف غالب نے
اشارہ کیا ہے مولوی سراج الدین احمد ہی ہیں ۔ غالب نے لکھا ہے
مولوی عبدالکریم کے ایک رشتہ دار نے خاص طور پر میری تذلیل و
تخریب کی غرض سے انجمن بانہادہ و مشاعرہ قرار داد ۔ شعرائے ریختہ
کو مصرعہ ریختہ ، شعرائے فارسی کو مصرعے فارسی اور مجھے دونوں بھیجے
یکشنبہ گذشتہ ۸ر جون کو میں بھی گیا ۔ اور دونوں زبانوں کی طرح
غزلیں پڑھیں ۔ خاص و عام متلذذ ہوئے ۔ اور مصنف کے ایک گروہ

۱؎ مجموعہ دہلی اور غالب ۔ رسالہ " اردو " کراچی ۔ غالب نمبر ۱۹۶۹ء

نے کہا کہ ہرگز این پایہ فصاحت اقتیل چہ بلاست ؟"

"قتیل چہ بلاست" سے ظاہر ہے کہ یہ مشاعرہ کلکتہ مدرسہ عالیہ کے مشاعرے کے بعد ہوا ہے۔ ورنہ "قتیل چہ بلاست" کے الفاظ غالب ہرگز نہ لکھتے چونکہ یہ مشاعرہ ماہ جون میں ہوا ہے لہٰذا مدرسہ عالیہ کلکتہ کا مشاعرہ مارچ یا اپریل میں ہوا ہو گا۔

۱۴ شائق - خواجہ فیض الدین

نام خواجہ فیض الدین عرف خواجہ حیدر جہاں اور تخلص شائق تھا۔ مولد و مسکن شہر ڈھاکہ مشرقی بنگال ولد خواجہ خلیل اللہ۔

رسالہ جادو ڈھاکہ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء میں شعرائے ڈھاکہ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے قاضی عبدالودود نے لکھا ہے ۱: "خواجگان ڈھاکہ کے ذی اثر ممبر خواجہ خلیل اللہ خان کے فرزند تھے۔ علوم عربیہ و فارسیہ کی باقاعدہ تحصیل نہ تھی۔ غالب سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ حاصل کیا تھا۔ غالب نے انہیں طوطی بنگال کا خطاب دیا تھا۔ آغا احمد علی اور غالب کے معرکہ میں بھی شریک تھے مگر اب اس کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ غالب نے اپنے کسی خط میں اس شاگرد کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن محض اس بنا پر شائق کو شاگردان غالب

۱: ماثر غالب قاضی عبدالودود - ص ۵۶ - ۵۷

کی فہرست سے نکال باہر نہیں کیا جا سکتا ۔ چونکہ کئی شعراء ایسے بھی تھے
جو بذریعہ ڈاک غالبؔ سے اصلاح لیتے رہے ہیں ۔ جو خود غالبؔ
نے لکھا ہے [۱] بریلی اور لکھنؤ اور کلکتہ اور بمبئی اور سورت سے اکثر
حضرات نظم و نثر فارسی و ہندی بھیجتے رہتے ہیں اور میں خدمت
بجا لاتا ہوں ۔

بطور شاگرد غالبؔ، شائقؔ کا ذکر چند قدیم و جدید تذکرہ نگاروں
نے بھی کیا ہے ۔ عبدالغفور نساخؔ نے لکھا ہے [۲] شاگرد مرزا نوشہ
غالبؔ، شعر فارسی و اردو ان کے پُر درد ہوتے ہیں ۔ ایک چھوٹا سا
دیوان ان کا نظر سے گذرا ۔ بارہ تیرہ برس ہوئے کہ فوت کی کلکتہ
میں بھی آئے تھے " غالبؔ سے اصلاح لینے کا ذکر کرتے ہوئے وفا
راشدی لکھتے ہیں [۳] " سرزمین بنگالہ میں جن ارباب ذوق کو
مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، دہلوی جیسے یگانہ روزگار اُستاد
کے دامن فیض سے وابستگی کا فخر حاصل تھا ۔ اُن میں نواب
سید محمود آزادؔ کی طرح عبدالرحمان شائقؔ بھی ایک تھے ۔ " ایک اور
جگہ سید حافظ اکرام احمد ضیغمؔ کے معاصرین کا ذکر کرتے ہوئے وفا
صاحب نے لکھا ہے ۔ " بنگال کے معاصرین میں خواجہ عبدالرحیم صباؔ

---

[۱] عود ہندی ۔ غالبؔ خط بنام غلام غوث بیخبر [۲] سخن شعراء ۔ عبدالغفور نساخؔ ۲۰۴
[۳] بنگال میں اُردو ۔ وفا راشدی

خواجہ فیض الدین شائقؔ تلمیذ غالبؔ وغیرہ جیسے سخن سنج موجود تھے۔

۱۳۔ **شوخیؔ۔ نادر خان** — نام منشی نادر خان، ولد محمد ضامن خان تخلص شوخیؔ۔ مولد دہلی

قوم پٹھان۔ ساکن رامپور۔ ایک عرصہ تک کلکتہ میں تھے۔ شوخیؔ کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزادؔ نے بڑی تفصیل اور دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔ یہاں صرف چند جملے نقل کرتا ہوں۔ "مرزا غالبؔ کے آخری عہد کے ایک شاگرد نادر خان شوخیؔ رامپور کے باشندے کلکتے میں رہتے تھے۔ میری تیرہ۔ چودہ برس کی عمر تھی کہ شاعری کا خبط ہوا۔ اور اس خبط نے ان سے ملایا۔" شوخیؔ کے شعر پڑھنے کا انداز پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزادؔ لکھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل عجیب انداز سے پڑھتے تھے۔ ایک اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہو جاتا تھا۔ جونہی شمع سامنے آتی تھی آس پاس سے ہٹ کر لوگ دور جا بیٹھتے۔ کیونکہ جانتے تھے اب پاس والوں کی خیر نہیں۔ دل بڑھے"۔ "بستر سے" انہوں نے غزل پڑھی۔

ہوئی شوخیؔ جو حجت وصل میں اس ماہ پیکر سے
گواہی ہم نے دلوادی شکن آلودہ بستر سے

دوسرا مصرعہ پڑھتے ہوئے اس طرح فرش کو مٹھیوں میں بھینچ بھینچ کر شکن آلودہ کرنے کی کوشش کی کہ ساری مجلس نے محسوس کیا کہ ان کے نیچے سے فرش نکل رہا ہے۔ کئی آدمی فرش کے ساتھ صفوں سے باہر نکل آئے۔ بہت سے مضطرب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ معاملہ کیا ہے۔"

مولانا نے مزید لکھا ہے۔ "نادر خان نے مجھے اپنا ایک قطعہ بھی دکھایا تھا۔ جس پر مرزا غالب کے قلم کی اصلاح تھی ایک موٹے مقدمے پر لگا کر وصلی کی طرح اسے محفوظ کر رکھا تھا میں ہمیشہ ان سے کہتا تھا کہ مجھے دے دیجئے مگر ہاں ہاں کر کے ٹال دیتے تھے۔ نہیں معلوم اس کا کیا حشر ہوا۔ میں پھر بمبئی چلا گیا۔ واپس آیا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔"

۱۴ طپاں۔ مرزا احمد خان بیگ

مرزا غالب کی ایک غزل مرزا احمد خاں بیگ طپاں سید ابو القاسم خاں قاسم کے متعلق ہے۔ جس کے ابتدائی اشعار ہیں۔

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوں دو سر تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زبان حضرتِ قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

احمد بیگ طپاں دہلی کے باشندے تھے۔ لیکن ملازمت کی بنا

پر عرصے تک کلکتہ میں رہے ہیں۔ کلکتہ کے مشہور استادِ سخن مرزا جان تپش مصنف "بہار دانش" کے دامن فیض سے طپاں نے فیض اٹھایا ہے۔ اور تپش کے نامور شاگردوں میں طپاں کا نام سر فہرست آتا ہے۔ قاضی عبدالودود نے طپاں کے سلسلے میں لکھا ہے۔[۱]

نواب احمد بخش کے برادر بزرگ کے سالے تپش کے شاگرد اور صدر دیوانی کلکتہ کے مختار تھے۔ جاہ مندانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ عمر میں دس بیس برس غالب سے بڑے ہوں تو عجب نہیں غالب نے انہیں اپنے احباب میں شمار کیا ہے۔ دہلی کی ملاقات تھی یا نہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ کلکتہ میں بہت گہرے تعلقات ہو گئے تھے اور طپاں نے غالب کو اپنے ساتھ ٹھہرانا چاہا تھا مگر غالب اس پر راضی نہیں ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ دہلی پہونچ کر کچھ دن بعد غالب کو یہ گمان ہوا کہ مرزا حاجی کے سالے مرزا افضل بیگ نے جہاں تک مرزا حاجی کے معاملے کا سروکار ہے انہیں اپنا ہمخیال بنالیا ہے (لہٰذا) ایک بار قاسم سے طپاں کی شکایت کی ہے ۔ ۔ ۔ بعد کو صفائی ہو گئی تھی ورنہ طپاں اپنی اس خواہش کا اظہار غالب سے نہ کرتے کہ وہ افضل بیگ کی وفات کے بعد کلکتہ میں شاہ دہلی کا سفیر ہونا چاہتے ہیں۔" طپاں کا

---

[۱] مآثر غالب ۔ قاضی عبدالودود

انتقال مارچ ۱۸۳۲ء میں ہوا۔ طپاں کی موت کے بعد غالب نے
شیفتہ سے استدعا کی تھی کہ طپاں کا حال اور کلام اپنے تذکرے
میں درج کریں حالانکہ اس کی کوئی صورت نہ نکلی۔ طپاں کے
نام غالب کے کئی خطوط بھی ہیں۔

۱۵ عاشق علی خان

جب غالب کلکتے میں تھے تب منشی عاشق علی خان کلکتہ میں غالباً سفیر
شاہ اودھ تھے اور مرزا سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ غالب
کے کئی خطوط میں منشی عاشق علی خان کا نام پایا جاتا ہے۔ جس سے
معلوم ہوتا ہے کہ منشی عاشق علی ان پر مہربان تھے۔ لیکن عاشق علی
سفارت سے مستعفی بھی غالب کے کلکتہ میں رہتے ہوئے ہی ہوگئے تھے
جس کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں:۔ "سنیچر ۲۷ شوال کو
منشی عاشق علی خاں بہادر میرے ہاں آئے۔ افسوس کہ وہ
سفارت سے مستعفی ہوگئے ہیں اور دو ہفتوں سے بارگاہ میں نہیں
جاتے ہیں۔ بطور خود یہاں مقیم ہیں۔ دوران گفتگو میں بولے کہ
منشی محمد حسن دہلی پہونچ گئے ہیں اور اپنے خدمات پر مامور ہیں"۔
ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ "منشی عاشق علی خان یکم ذی الحجہ
کو براہ دریا کلکتہ سے روانہ ہوئے۔ جہت سفر مجھے معلوم نہیں۔
حکیم ظفر علی خان جو اشرف فیض آباد سے ہیں ان کی جگہ عہدہ سفارت

یہ لکھنؤ سے آئے ہیں۔"

مولوی عبدالقادر رام پور

۶۶ عبدالقادر رامپوری

کے باشندے تھے اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مرزا غالب کے اعزاز میں جو مشاعرہ ہوا تھا اس میں شریک تھے۔ کلام غالب پر جن حضرات نے نکتہ چینی کی تھی ان میں سے آپ بھی ایک رہے ہیں۔ آپ نواب عماد الملک بلگرامی کے دادا تھے

منشی عبدالکریم لکھنؤ

۶۷ عبدالکریم — (مولوی۔ منشی)

کے باشندے تھے اور عرصے تک بنگال میں تھے۔ آپ بنگال میں غالب کے نہایت عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کے بھتیجا ہوتے تھے اور آپ دفتر فارسی کلکتہ میں بطور میر منشی کے ملازمت کرتے تھے۔ غالب جب پنشن کے سلسلے میں کلکتہ آئے تب منشی عبدالکریم نے دفتری معاملات میں غالب کی کافی مدد کی تھی جس کا ذکر جابجا غالب نے اپنے فارسی خطوط میں کیا ہے۔ منشی عبدالکریم کے نام غالب کے کئی خطوط ہیں۔ غالب کا ایک خط جو کہ جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء کا ہے سے علم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں مولوی عبدالکریم کا انتقال ہو چکا تھا۔ یہ خط انہوں نے میاں داد خاں سیاح کے نام لکھا۔ لکھتے ہیں۔" ہائے مولوی محمد حسن اور مولوی

عبدالکریم اسی عہد میں اگر ان بزرگوں میں سے ایک ہوتا تو میں کیوں اپنی قسمت کو روتا۔ وقت گزر جاتا ہے اور بات رہ جاتی ہے۔"

نواب عبداللطیف خان بہادر

۱۸ عبداللطیف خان بہادر کی زندگی۔ ادبی سماجی خدمات پر کسی تصنیف میں روشنی نہیں ڈالی گئی ہے حالانکہ غالب اور بنگال کا ذکر کرتے ہوئے اس نام کو چند حضرات نے لیا ہے اکثر نے صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ وہ گستاخ کے بڑے بھائی تھے اور بعض بعض نے دو چار اور جملے لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ لہٰذا یہاں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کے حالات قلمبند کروں جس کا کسی اردو تصنیف میں ذکر نہیں ہے

خان بہادر نواب عبداللطیف کے والد کا نام قاضی فقیر محمد تھا جو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے ایک سرکاری وکیل تھے آپ فارسی کے بہت اچھے ادیب تھے اور آپ کا مشہور ادبی کارنامہ "جامع التواریخ" یا "تواریخ لکھنو" ہے جو ان کی وفات ۱۸۴۴ء کے بعد ۱۸۹۷ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ قاضی مرحوم کی دو بیویاں تھیں۔ ایک بیوی سے نواب عبداللطیف اور گستاخ تھے اور دوسری بیوی سے مولوی عبدالحمید اور مولوی عبدالباری۔

عبداللطیف ۱۸۲۸ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوئے۔ عبداللطیف اور عبدالغفور نساخ دونوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تعلیم پائی یہ انگریزی تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا اور بڑے بڑے گھرانوں کے لڑکے انگریزی تعلیم پانے لگے تھے۔ لیکن پھر بھی مسلمان انگریزی تعلیم سے دور تھے جیسا کہ وفا راشدی مصنف "بنگال میں اردو" نے لکھا ہے۔۔۔ "مسلمانوں کی انتہائی بدبختی تھی کہ انہوں نے پہلے پہل اس سات سمندر پار کی زبان کو اپنانے میں "اسلام کو خطرے" میں محسوس کیا۔ کسی نے اس کے پڑھنے والوں پر کفر کا فتویٰ صادر کردیا، کسی نے اس کے حامیوں کو "دشمن اسلام" قرار دیا۔ کسی نے "روایتی توہین" تصور کیا۔ اور جانے مذہب کی آڑ میں کیا کیا گلہائے رنگا رنگ کھلائے گئے۔ آفریں ہے ان دور اندیش ذی فہم و باعث نفوس پر جنہوں نے انگریزی کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اسے سیکھی۔ عوام میں اس اجنبی اور غیر مانوس زبان کی توسیع و اشاعت اور تعلیمی بیداری کی کوشش کی۔ ایسی بلند ہستیوں میں سرسید احمد خان کی طرح بنگال میں حاجی محمد محسن۔ نواب عبداللطیف اور ان کے بھائی خان بہادر ابو محمد عبدالغفور خان نساخ کے نام بڑی عزت اور احترام سے لئے جاتے ہیں۔

معلوم نہیں نساخ کا نام وفا راشدی نے کن بنیادوں پر

لیا ہے ۔ نساخ کو انگریزی تعلیم سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور وہ سماجی تحریکوں سے بھی دور دور رہے ہیں ۔ وہ شاعر تھے اُردو کے شاعر اور مشاعروں کی محفلوں اور ادبی دنیا ہی میں اپنا وقت گذارا کرتے تھے ۔ ہمیں بنگال میں انگریزی تعلیم کی تحریک اور اس کی نشو و نما کی تاریخ میں نساخ کہیں نہیں ملتے ہیں اور خود نساخ کا رجحان انگریزی تعلیم کی طرف بہت کم رہا ہے جس کی وجہ سے وہ عربی ۔ فارسی اور اردو کو لے کر آگے بڑھے لیکن عبداللطیف نے انگریزی تعلیم پائی ۔ بنگالی مسلمانوں میں نواب عبداللطیف پہلے گریجویٹ ہیں جنہوں نے انگریزی کے ساتھ امتحان دیا ۔

جن دنوں نواب عبداللطیف کلکتہ مدرسہ سے کامیاب ہو کر نکلے ان دنوں سندھ کا ایک امیر جو بطور قیدی دم دم (کلکتہ) میں لایا گیا تھا کے ہاں وہ بطور منشی ملازم ہوئے اور ایک سال ان کے ہاں خط و کتابت کرنے کا کام کرتے رہے ۔ پھر ڈھاکہ کالجیٹ اسکول کے ٹیچر ہو کر ڈھاکہ چلے گئے ۔ لیکن ڈھاکہ میں غالباً سال دو سال سے زیادہ نہیں رہے ۔ چونکہ ڈھاکہ سے وہ مسٹر سامویل کے کلرک ہو کر لوٹے تھے اور کلکتہ میں آنے کے کچھ عرصہ بعد وہ مدرسہ عالیہ کے انگریزی ٹیچر مقرر ہو گئے ۔

جب وہ مدرسہ عالیہ کے انگریزی مدرس تھے ان دنوں

ان کی قسمت کا ستارہ بلند ہوا اور دو سو روپیہ تنخواہ پر وہ ڈپٹی مجسٹریٹ بن گئے۔ آپ کا یہ تقرر ضلع ۲۴ پرگنہ کی عدالت یعنی علی پور کی عدالت میں ہوا تھا۔ یہ اپریل ۱۸۴۹ء کا واقعہ ہے اس سے آپ کی شہرت و عزت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ مسلمانوں میں غالباً عبداللطیف ہی سب سے پہلے ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے ہیں چونکہ یہاں تک میں نے اس سلسلے میں تحقیق کی ہے۔ مجھے ان سے پہلے کسی مسلمان مجسٹریٹ کا علم حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کے تین ماہ بعد آپ بنگال بہار اور اڑیسہ کے جسٹس آف پیس ہوگئے۔ ۱۸۶۲ء میں جب علی پور پولیس کورٹ قائم ہوا تب آپ اس عدالت کے ڈپٹی مجسٹریٹ درجہ اول ہو کر آئے اور عرصہ دس سال تک اس عہدے پر رہے اس کے بعد کچھ عرصہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ رہے اور آخر کار ۱۸۷۷ء میں سیالدہ دکلکتہ کورٹ کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے اور اس عہدے پر رہتے ہوئے ۱۸۸۵ء میں باعزت طور پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

ملازمت کے بعد نواب عبداللطیف ۱۸۸۶ء میں ریاست بھوپال کے وزیر اعلیٰ مقرر ہو کے بھوپال گئے تھے لیکن وہاں زیادہ عرصہ نہیں رہے اور جلد ہی بنگال لوٹ آئے۔

بنگال میں نواب عبداللطیف ہی سرسید احمد خان کے سب سے بڑے دوست اور ساتھی رہے ہیں۔ جنہوں نے سرسید کی تحریک

کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے کی کئی اطلاعات ہمیں خطبات گارساں دتاسی میں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ ۵ اپریل ۱۸۶۳ء میں آپ نے کلکتے میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کے نام سے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی جس کے آپ تاحیات صدر رہے۔ بنگال میں سول سروس کے امتحانات کی جو کونسل (۱۸۸۳ء) تھی اس کے اراکین میں سے آپ ایک رہے ہیں۔ علی گڑھ کے انجمن اسلام کے آپ ایک سرگرم رکن تھے۔ مولانا کرامت علی جونپوری (امام باڑہ ہوگلی کے متولی) سے آپ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ ۱۸۶۰ء میں آپ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے رکن ہوئے اور پھر سوسائٹی مذکور کے کاؤنسل ممبر بھی ہوئے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے دور اول کے صد سالہ تاریخ میں آپ واحد مسلمان ہیں جن کو کاؤنسل ممبر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

بنگال میں نواب عبداللطیف خان بہادر کو ہندو مسلم اتحاد کا ایک ستون تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کو بنگالی کے ہندو بھی اتنا ہی چاہتے تھے جتنا کہ مسلم سماج میں ان کی عزت تھی۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ ان کی موت پر سر سریندر ناتھ بنرجی جیسے مشہور ہندو عالم و رہنما نے آپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ــــ " نواب عبداللطیف نے اپنی پوری زندگی ملک کی ترقی کے لیے کام کرتے ہوئے صرف کیا ہے۔ ہم ہندو بھی ان

کی موت پر مسلمانوں کے ساتھ ان کے غم میں شریک ہیں اور مساوی حق پاتے ہیں۔ جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندو گھروں میں نواب لطیف کا نام بڑی عزت سے ہمیشہ لیا جائے گا۔"

غالب کا ذکر کرتے ہوئے بعض نے نواب عبداللطیف سے غالب کے تعلقات کا ذکر کیا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ نواب عبداللطیف سے غالب کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ مولانا آزاد نے نساخ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ نساخ نواب عبداللطیف کے بھائی تھے لہٰذا غالب نے ان کی تعریف یوں کی ہے۔ مرزا غالب سے عبداللطیف کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جاوید نہال نے لکھا ہے ــــــ "پنشن کے قضیہ کی دوڑ دھوپ کے دوران مولوی سراج الدین کی وساطت سے بنگال کے مشہور شاعر عبدالغفور نساخ کے بڑے بھائی سے غالب کی ملاقات ہوئی نواب لطیف صرف شاعر اور ادیب ہی نہیں تھے بلکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی تھے۔ اس لئے وہ بااثر اور بارسوخ تھے۔ غالب کو پنشن کے مقدمے میں نواب صاحب سے خاص مدد ملی تھی"[۱] اور آگے چل کر انہوں نے مزید لکھا ــــ "نساخ کے چار بھائی تھے

۱۔ غالب سے بنگال کا رشتہ ۔ از پروفیسر جاوید نہال

ان میں صرف نواب عبداللطیف مشہور ہوئے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت نے اردو کے سب سے بڑے شاعر غالب کو بھی متاثر کیا۔"
—— سمجھ میں نہیں آتا کہ پروفیسر جاوید نہال نے یہ سب کیونکر دریافت کر لیا۔ چونکہ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں کوئی حوالہ نہیں دیا جہاں سے ان کو یہ علم ہوا ہو۔ اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ باتیں ان کے دماغ کی پیداوار ہیں۔ یہ جملہ بھی عجیب و غریب ہے کہ "نساخ کے چار بھائی تھے ان میں صرف نواب عبداللطیف مشہور ہوئے۔" کیا نساخ مشہور نہیں ہوئے۔ اگر نہیں ہوئے تو نساخ سے ان کا رشتہ ظاہر کرنا کیا معنی۔؟
۔ پروفیسر جاوید نہال نے جو کچھ غالب اور نواب عبداللطیف کے تعلقات کے سلسلے میں لکھا وہ باتیں ناممکن ہیں اور درست نہیں ہیں۔ چونکہ جس زمانے میں غالب کلکتہ آئے تھے ان دنوں نواب عبداللطیف ڈپٹی مجسٹریٹ نہیں تھے لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ سراج الدین نے غالب سے عبداللطیف کا ذکر کیا جب کہ عبداللطیف ان دنوں صرف ایک شیر خوار بچہ ہی تھا۔ عبداللطیف کا ذکر کیا جبکہ عبداللطیف کا ستارہ ۱۸۵۴ء میں پہلی بار چمکا جبکہ غالب کلکتہ میں فروری ۱۸۲۸ء میں آئے تھے جو کہ عبداللطیف کا صرف سنہ پیدائش ہے۔ لہٰذا نواب لطیف سے غالب کی ملاقات اور دوستی کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے تاریخ کی روشنی میں، وہ باتیں۔

سراسر غلط ہیں۔

نواب عبداللطیف ۶۵ سال کی عمر میں ۱۰ر جولائی ۱۸۹۱ء
کو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

۱۹ علی اکبر خان طباطبائی

یہ نام کہیں اکبر علی خان ہے تو کہیں علی اکبر خان حتیٰ کہ حکومت کے ریکارڈ امام باڑہ ہگلی COLLECTION OF PAPERS RELATING TO THE HOOGLY IMAMBARA 1815 - 1910 میں بھی کہیں وہ نام اکبر علی ہے تو کہیں علی اکبر۔ لیکن چونکہ غالب نے علی اکبر خاں لکھا ہے اور یہی نام درست بھی لگتا ہے۔ لہٰذا میں علی اکبر خان ہی لکھتا ہوں۔

حاجی محمد محسن بے اولاد تھے۔ اس لئے بڑھاپے میں انہوں نے ہگلی کی زمینداری اور دیگر گردونوں کی جائداد کو ایک وقف بورڈ بنا کر اس وقف کے حوالے اپنی وصیت کے مطابق کر دیا اس وصیت نامے کی تاریخ ۲۰ر اپریل ۱۸۰۶ء ہے جس کی رو سے رجب علی خان ولد شیخ محمد صادق اور شاکر علی خان ولد احمد خان ہگلی کی جائداد کے متولی مقرر ہوئے۔ حاجی محمد محسن کے انتقال (۱۸۱۲ء) کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہگلی کے متولی لوگوں کے خلاف عوام کی شکایت آنے لگیں اور حکومت وقت کو مداخلت کرنی پڑی۔ مورخہ ۷ر اگست ۱۸۱۵ء حکومت کا حکم نامہ نمبر ۸۳۳

کے مطابق اکبر علی خان (علی اکبر خان) دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر امام باڑہ ہگلی کے متولی مقرر ہوئے۔

کلکتہ آتے ہوئے مرزا غالب باندہ میں رکے تھے جہاں محمد علی خان صدر امین باندہ سے وہ ملے۔ یہی صدر امین محمد علی خان سے نواب علی اکبر خان طب طبائی کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ جس کی وجہ سے مولوی محمد علی خان نے غالب کا تعارف کرتے ہوئے ایک تعارفی خط علی اکبر خان کے نام لکھ کر مرزا غالب کو دیا تھا اور اسی خط کو لے کر غالب کلکتہ پہنچنے کے دو دن بعد ہگلی گئے اور وہاں علی اکبر خان سے ملاقات کی۔

غالب کے کئی خطوط میں بنگال میں ان کے اس محسن کا ذکر موجود ہے جن کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ نواب علی اکبر خان کے حسن اخلاق محبت اور دوستی نے غالب کو رام کر لیا تھا ذیل میں خطوط غالب سے چند اقتباسات درج کرتا ہوں جن سے دونوں کے گہرے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

محمد علی خان کے ایک خط میں نواب علی اکبر خان کے سلسلے میں غالب لکھتے ہیں:[1] "علی اکبر خان طب طبائی سا صاحب دل بنگالہ میں نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ گرامی گوہر کس

---

[1] مجموعہ دہلی اور غالب۔ قاضی عبدالودود سہ ماہی اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

کان کا ہے۔ ہگلی جب آتے ہیں تو میرے یہاں ضرور آتے ہیں۔ انہوں نے میری مدد کی۔ ان کی چھوٹی بیٹی کی شادی در پیش ہے۔ مجھ سے فرما گئے ہیں کہ میں طلب کروں تو ایک ہفتے کے لئے میرے یہاں آ کر رہو۔ اس کا منتظر ہوں۔ ظاہراً تاریخ ابھی مقرر نہیں ہوئی ان کے دو رقعے ملفوف ہیں۔ آپ ان کی خاکسار نوازی سے آگاہ ہوں۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ——— "علی اکبر خان ہگلی میں ہیں۔ تین بار وہاں گیا ہوں اور وہ بھی ایک بار جب کلکتہ آئے تھے تو میرے یہاں تشریف لائے تھے۔ کافر ہوں اگر دہلی سے کلکتہ تک ایک معمر امیر اس لطافت طبع۔ نزاکت طبع۔ حسن بیان۔ فہم درست اور مشرب صاف کے ساتھ دیکھا ہوں۔ یہ مہذب بھی ہیں اور مہذب بھی۔"

کتاب ہٰذا میں غالب اور آم نیز غالب اور ہگلی کے تحت راقم الحروف یہ لکھ چکا ہے کہ غالب کئی بار علی اکبر خان سے ملنے ہگلی گئے تھے اور علی اکبر خان کی بدولت غالب نے بنگال کے آم خوب خوب کھائے ہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مشاعرے سے جس ادبی ہنگامے کی ابتدا ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے غالب نے "باد مخالف" لکھی اس میں بھی ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نواب علی اکبر نے غالب کا ساتھ دیا اور ان کے کہنے پر ہی غالب نے "باد مخالف" لکھنے کا فیصلہ کیا

اور لکھ کر ان کے حوالے کیا۔ یہ تمام واقعات غالب اور علی اکبر خاں کی دوستی پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

اب نواب علی اکبر خان بہادر طباطبائی کے سلسلے میں دو چار ایسی باتیں کہنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے ان کی زندگی کے حالات پر مزید روشنی پڑے، چونکہ غالب کے سلسلے میں لکھنے والوں میں سے کسی نے بھی ان کے حالات پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ غالب کے ایک مذکورہ خط میں ہم یہ ذکر پاتے ہیں کہ علی اکبر خان نے ان کی چھوٹی بیٹی کی شادی کے موقع پر غالب کو ہگلی آنے اور وہاں ایک ہفتہ تک قیام کرنے کی دعوت دی تھی غالب۔ یہی وہ دولہا ہے جس کا نام غالب علی تھا۔ اور جو ان کے بعد امام باڑہ ہگلی کے متولی ہوئے تھے۔ امام باڑہ ہگلی سے متعلقہ کاغذات کے مطابق حکم نامہ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۲ جون ۱۸۳۶ء کے رو سے عارضی طور پر غالب علی (علی اکبر خان کا داماد) امام باڑہ کے متولی مقرر ہوئے تھے۔ حالانکہ وہ صرف چند دنوں ہی اس عہدے پر رہے۔ جن کے بعد مولوی کرم حسین کے فرزند زین الدین حسین (۲۹ جون ۱۸۳۶ء) متولی مقرر ہو گئے۔

علی اکبر خان جن کے حسن واخلاق کا غالب نے خوب خوب گن گائے ہیں۔ طویل عرصے تک امام باڑہ ہگلی کے متولی نہیں رہ سکے چونکہ ان پر بھی عوامی مال و دولت یعنی وقف جائداد کا ناجائز طور

اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کا سنگین الزام عاید ہوا۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے ۸۲۱۸ ۲۳ روپے اپنے ذاتی مفاد پر خرچ کئے ہیں۔ اس سلسلے میں علی اکبر خان کے خلاف عرصہ تک مقدمہ بھی چلا اس دور میں یہ رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ اس مقدمے کے سلسلے میں کلکتے کا مشہور تجارتی انگریزی فرم میکانٹوس اینڈ کمپنی نے علی اکبر خان کی طرف سے دس ہزار روپیوں کی ضمانت (مورخہ ۷ ار مارچ ۱۸۲۹ء) دی تھی لیکن علی اکبر خان پر الزام ثابت ہو گیا اور حکومت کا خط نمبر ۸۸۹ مورخہ ۱۴ر جون ۱۸۳۶ء کے مطابق علی اکبر خان کو متولی کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔

مرزا غالب نے ایک غزل میں

قاسم ۔ سید ابو القاسم خان قاسم اور طپاں کی تعریف کی ہے۔ جس کے ابتدائی دو شعر یوں ہیں۔

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئے دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زباں، حضرت قاسم و طپاں
ایک تپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک

کلکتے میں غالب کی ملاقات قاسم اور طپاں سے ہوئی تھی قاسم کا مکمل نام سید ابو القاسم خان تھا۔ اور بقول قاسم انہوں نے یہ نام آنحضرت کی عقیدت میں اختیار کیا تھا۔ گارساں دتاسی قاسم اور ان کا تذکرہ شعراء "مجموعہ نغز" (۱۲۲۱ھ) کا ذکر

دسمبر ۱۸۵۷ء کے خطبہ میں کیا ہے۔ کلیات نثر فارسی (صفحہ ۱۰۰) کے
مطابق کرنل ہنری املاک کے نام غالب کا تعارف کرتے ہوئے کلکتے
کے اسی غالب نواز دوست مرزا ابوالقاسم خان نے غالب کو
خط لکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ غالب رقمطراز ہیں۔

"میرزا ابوالقاسم خاں وعدہ داد کہ چوں کرنیل املاک
را فرجام رنجوری بر خیزد نیا نامہ از دے رد"۔ لیکن کرنل
ہنری بیمار ہو گئے اور چل بسے

قاسم کا انتقال ہیضہ کی بنا پر ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء میں ہوا۔

۱۴۔ کرم حسین بلگرامی غالب نے چند خطوط میں مولوی کرم حسین کا ذکر کیا ہے جس سے
پتہ چلتا ہے کہ کرم حسین نے واقعی غالب پر کرم کیا تھا۔ غالب نے
ایک قطعہ "در مدح ڈلی" کلکتے میں کہا تھا۔ اور اس کا تعلق
اسی مولوی کرم حسین سے ہے۔ مرزا حاتم علی مہر کے نام ایک خط
میں غالب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ـــ

"ایک میرا قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتے میں کہا تھا۔ اور تقریب
یہ کہ مولوی کرم حسین صاحب ایک میرے دوست تھے۔ انہوں نے
ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست
پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے
وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر اس قطعہ میں حجلہ تیرہ شعر ہیں ما قطع

گھہ گران کو دیا صلہ میں دو ڈلی ان سے لی ۔"

پچھلے صفحات میں جنھیے جے متر ارمان کا ذکر کرتے ہوئے "چکنی ڈلی" کے سلسلہ میں غالب کے اس قطعہ پر روشنی ڈال چکا ہوں ۔ لہٰذا یہاں پھر سے لکھنا غیر ضروری ہے ۔

کرم حسین نے غالب کے اعزاز میں کلکتہ میں چند مخصوص مشاعرے منعقد کئے تھے جن کا ذکر عبدالغفور نساخ کے حوالے سے مولانا آزاد نے کیا ہے ۔ انہوں نے لکھا ہے "جب مرزا غالب کلکتے میں مقیم تھے ۔ تو شاہ اودھ کے وکیل نے فارسی کے کئی مشاعرے اپنے یہاں منعقد کئے ۔ اور کلکتے کے ایرانیوں کی تعداد ان میں شریک ہوتی تھی ۔ ایک مشاعرے کی یہ طرح تھی ۔ جا نوشتہ ایم، ما نوشتہ ایم غالب نے غزل پڑھی تھی ۔

تا فضلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم
آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم

غالب کی یہ غزل ان کے فارسی دیوان میں موجود ہے جس کے اشعار کی تعداد ۱۲ ہیں ۔

شاہ اودھ کا وکیل یا سفیر ہونے کی حیثیت سے مولوی کرم حسین کو کلکتے کے سرکاری حلقوں میں اور اعلیٰ طبقہ میں باعزت مقام حاصل تھا یہاں کے علمی اور ادبی حلقوں میں وہ ایک علم دوست تسلیم

۱۔ غالب اور الواکلام ۔ مرتبہ عتیق صدیقی

کیے جاتے تھے۔ ان کا تعلق غالباً "کلکتہ اسکول بک سوسائٹی" سے بھی تھا، چونکہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۲۱ء کے بنگلہ اخبار "سماچار درپن" میں کلکتہ اسکول بک سوسائٹی کے تیسرے سالانہ جلسے کی روداد چھپی ہے، جس میں مولوی کرم حسین کا نام بھی ہے۔

سید زین الدین حسین ولد مولوی کرم حسین میر غالب علی خان (داماد علی اکبر خان طباطبائی) کے بعد امام باڑہ ہوگلی کے متولی مقرر ہوئے تھے۔ غالباً یہ سید زین الدین حسین ہمارے اسی مولوی کرم حسین کے فرزند نیک رہے ہیں۔ سید زین الدین حسین جون ۱۸۳۶ء میں امام باڑہ ہگلی کے متولی ہوئے۔

۲۲ کفایت خان

کفایت خان ایک ایرانی رئیس تھے جو کلکتے میں شاہزادہ کامران والی ہرات کے سفیر تھے۔ کلکتے کی ایرانی سماج سے غالب کا گہرا تعلق رہا ہے جس کا ذکر نساخ اور ان کے حوالے سے مولانا آزاد نے کیا ہے۔

مدرسہ عالیہ کلکتہ کا وہ مشاعرہ جس میں غالب نے غزل پڑھی اور ایک ادبی ہنگامے کا آغاز ہوا، میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کے طرفدار زیادہ تر یہی ایرانی حضرات رہے ہیں۔ کفایت خان بھی اس مشاعرے میں شریک تھے، جنہوں نے غالب کی طرفداری کی تھی۔ بقول غالب جب شعرائے کلکتہ نے غزلیں پڑھیں تو کفایت خاں زیر لب مسکراتے رہے۔ اور جب غالب کی باری آئی اور انھوں نے اپنا

کلام پیش کیا تو کفایت خان نے دل کھول کر داد دی۔ جس وقت
"ہمہ عالم" کی ترکیب پر مجلس میں تنقید کی گئی تب پہلے پہل مرزا غالب
خود خاموش رہے اور ان کی طرف سے کفایت خان نے ہی "ہمہ عالم"
کی سند پیش کرتے ہوئے جوابات دیئے تھے۔ غالب نے اس واقعہ
کا ذکر اپنے کئی فارسی و اردو خطوط میں کیا ہے اس سلسلے میں ضروری
باتیں چونکہ مدرسہ عالیہ کے باب میں آچکا ہے اس لئے یہاں دہرانا
ضروری نہیں۔

۲۳ عبدالغفور نساخ

عبدالغفور نساخ کی سوانح حیات
تصنیف اور دیگر ادبی خدمات پر
کئی تصانیف اردو میں موجود ہیں۔ جن میں سید لطیف الرحمان کی
تصنیف نہایت ہی اہم ہے۔ لہٰذا یہاں صرف نساخ اور غالب کے
سلسلے چند ضروری باتیں عرض کرتا ہوں۔

نساخ شیفتہ کے شاگرد تھے۔ لیکن نساخ کو اس بات کا فخر
بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنا کلام مرزا غالب کو دکھایا ہے
نساخ کی خود نوشت سوانح عمری (قلمی) کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے
کہ نساخ چار مرتبہ دہلی گئے اور وہاں غالب سے ان کی ملاقاتیں
ہوئی ہیں۔ نساخ لکھتے ہیں ــــ "۱۲۸۴ھ کے ماہ رمضان
المبارک میں علاج کے لیے دہلی گیا۔ ....
مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی صاحب معلوم ہوتا

ہے کہ تم بھی میری طرح سات آٹھ سال کی عمر سے شعر کہتے ہو گے "
میں نے کہا "ہاں" ۔۔۔ عید کے دن مرزا صاحب اپنی مثنوی
"ابر گہر بار" کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے ۔ اہل دہلی کو تعجب
ہوا کیونکہ مرزا صاحب نے چار پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر
پڑھے نہ تھے بلکہ کوئی اگر ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تھا تو وہ خفا
ہو جاتے تھے ۔"

مرزا غالب کے جتنے خطوط اب تک منظر عام پر آئے ہیں ان
میں صرف ایک خط ناسخ کے نام ہے ۔ یہی وہ خط ہے جس میں
غالب نے ناسخ کا اولین دیوان " دفتر بے مثال " پر اپنے خیالات
کا اظہار کیا ہے ۔ اس خط اور کلام ناسخ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا
ابو الکلام آزاد نے لکھا ہے ۔ " غالب کے رقعات میں ایک رقعہ
انہی عبد الغفور نساخ کے نام ہے جس میں بےحد مدح کی گئی ہے ۔ انہوں
نے اپنا کلیات بھیجا تھا ۔ اس پر بطور تقریظ لکھتے ہیں کہ شیخ امام بخش
طرز قدیم کے ناسخ تھے ۔ آپ بلا مبالغہ بہ صیغہ مبالغہ ، نساخ ہیں
۔۔۔ حالانکہ ان کی پوری کلیات تمام تر خرفات سے لبریز ہے

ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا ۔ جس پر غالب کی یہ سعی مداحی صادق
آسکے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ باوجود بنگالہ نژاد ہونے
کے اردو میں تک بندی کر لیتے تھے ۔"

غالب نے نساخ کی اتنی تعریف کیوں کی پر روشنی ڈالتے ہوئے

مولانا آزاد مزید لکھتے ہیں۔ عبدالغفور نساخ نواب عبداللطیف کے بھائی اور بنگالی دبہار کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کا ڈپٹی کلکٹر ہونا بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ حکام عالیشان میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ پھر کلکتے سے انہوں نے خط وکتابت شروع کی تھی۔ کلکتے کے حکام میں ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ صدر کے ذی اقتدار لوگوں میں محدود ہیں۔ مرزا غالب کو خیال ہوا کہ ایسے شخص کو خوشنود کرنا انجام مقاصد کے لیے سود مند ہوگا بہت ممکن ہے کہ ان کی سعی و سفارش کار برآریوں میں کار آمد ہوجائے اسی لیے اپنے مسلک کے خلاف جتنی سعی کر سکتے تھے۔ کر گئے۔"

مولانا آزاد کا یہ خیال ایک حد تک درست ضرور ہے یعنی اپنی ضرورت کے تحت غالب حکام کی تعریف کرتے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کی یہ رائے کہ کلام نساخ محض "تک بندی" ہے کو کسی طور پر درست نہیں کہا جا سکتا۔ بلا شبہ نساخ اپنے دور کے ایک بلند مرتبہ شاعر اور ادیب تھے۔ بقول سید لطیف الرحمٰن ——

"نساخ کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ وہ بنگال کے بہت بڑے شاعر اور ادیب ہیں کافی نہیں۔ نساخ کا شمار ہندوستان و پاکستان کے مشاہیر شعراء و ادبا میں ہونا چاہیے۔ جہاں تک ادب اردو کا تعلق ہے بنگال میں ان کا کوئی مد مقابل نہیں۔ نساخ

کامل الفن شاعر بھی تھے۔ اور بڑے پایے کے ادیب بھی تھے۔"

"دفتر بے مثال" پر روشنی ڈالتے ہوئے لطیف الرحمن صاحب نے
لکھا ہے۔ "دفتر بے مثال اگرچہ کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ
ہے۔ لیکن اس گلدستے میں ایسے پھولوں کی کمی نہیں جو شاعرانہ آرٹ
کے وہ کرشمے ہیں کہ جسے پڑھ کر دل بھی مزہ لینے لگتا ہے۔ یہ وہی
دفتر بے مثال ہے۔ جس کے سلسلے میں مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ۔
۔"ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا۔ جس پر غالب کی یہ بے معنیٰ
مداحی صادق آسکے۔" اسی "دفتر بے مثال" کے سلسلے میں
گارساں دتاسی نے لکھا ہے۔ "ایک دوسری کتاب "دفتر بے مثال"
مجھے بھیجی گئی ہے ...... اس بیاض میں بعض بعض اچھے خاصے
شعر ملتے ہیں۔"

مولانا آزاد کے مذکورہ بیان پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر
جاوید نہالی نے بھی لکھا ہے ؎ "غالب اور نساخ کے فن اور
زندگی کے ایک خاص پہلو پر مولانا آزاد کی رائے سے روشنی ضرور
پڑتی ہے اور یہ بھی مان لیا جاسکتا ہے کہ غالب نے نساخ کی
شاعری کی مدح سرائی میں مبالغہ سے کام لیا۔ لیکن بنگالی کے
ایک ایسے استاد فن شاعر کے لیے "تک بندی" کا الزام کچھ جچتا
نہیں۔ نساخ نے بنگال میں اردو شاعری کی دنیا میں ہلچل پیدا

؎ بنگال سے غالب کا رشتہ۔ مضمون از جاوید نہالی۔ غالب صد سالہ نمبر کلکتہ کارپوریشن اردو میگزین

کی تھی۔ شاعری کو مقبول بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔"

بہر حال نساخ اردو کے ایک نامور شاعر و ادیب گذرے ہیں جن سے غالب کے اچھے تعلقات تھے جنہوں نے نظم و نثر کی تقریباً بیس کتابیں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔

(۲۴) وجاہت علی

مولوی وجاہت علی کا وطن لکھنؤ تھا۔ لیکن وہ کلکتے میں گورنر جنرل کے دفتر انشا میں ملازم تھے۔ آپ شاعر بھی تھے اور وجاہت تخلص فرماتے تھے۔ مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ کلکتہ کے ادبی ہنگامے (مدرسہ عالیہ کا مشاعرہ) میں جن شاگردانِ قتیل نے غالب کی مخالفت میں کھل کر حصہ لیا تھا آپ بھی ان میں سے ایک رہے ہیں۔

(۲۵) ولایت حسن خان

کلکتہ میں غالب کے قدر دانوں میں ایک مولوی ولایت حسن بھی تھے۔ غالب نے کئی فارسی و اُردو خطوط میں آپ کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں محمد علی خان کو لکھتے ہیں ——— "مولوی ولایت حسن خان دورے سے واپس آکر دو چار دن بعد پھر گئے مجھے بعد کو خبر ملی ورنہ ان کے پاس جاتا" ——— ایک اور خط میں لکھتے ہیں ——— "مولوی صاحب دورے سے پھر واپس آگئے ہیں۔ ناکامی روزگار گذشتہ کی تلافی کی اور ان کے پاس گیا۔ اس وقت انہیں کے یہاں ہوں اور یہ عرضداشت آپ کے پاس بھیجنے کے لئے انہیں کے حوالے کی ہے۔"

صدر امین باندا محمد علی خان کے نام غالب کے مذکورہ خطوط جن میں مولوی ولایت حسن خان کا ذکر ہے سے واضح ہوتا ہے کہ ولایت حسن خان غالب پر مہربان تھے۔ ان خطوط کے علاوہ سیاح کے نام ایک اردو خط میں جس کی تاریخ ۱۱ محرم ۳۱ جولائی ہے۔ (غالباً ۱۸۶۷ء ہوگا) میں ایک قطعہ تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے مولوی ولایت حسن کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ”کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسن خاں نے استدعائے تاریخ کی میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی میں موجود ہے۔“

۲۶ ولیم فریزر ولیم فریزر کا مکمل نام سائمن ولیم فریزر تھا جو کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی میں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے پر تھے۔ ولیم فریزر کا ذکر غالب نے کئی خطوط میں کیا ہے۔ جس سے فریزر سے کلکتے میں غالب کی ملاقات کے علاوہ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس عہد میں انگریز افسران معزز ہندوستانیوں کا استقبال کیوں کر کرتے تھے۔ غالب کے مطابق فریزر نے ان کا استقبال کرتے ہوئے ان کا معانقہ کیا پھر عطر دیا پان پیش کیا۔ اور جب غالب بعد ملاقات کے دفتر سے جانے لگے تو خود فریزر اٹھ کر ان کے ساتھ آئے اور چند قدم ان کے ساتھ چل کر انہیں عزت بخشی۔ ولیم فریزر کا کام کیا تھا کا ذکر کرتے ہوئے غالب نے لکھا ہے ۔۔۔۔ ” وہ کل اہل حاجات

اور صاحبان کونسل کے درمیان واسطہ ہیں۔ عرائض پہلے انہیں کے پاس پہنچتے ہیں۔ اور وہ ان کا انگریزی ترجمہ صاحبان کونسل کو پیش کرتے ہیں ...... فریزر صاحب کو اختیار ہے کہ اگر کسی مقدمے کو کونسل کے قابل نہ سمجھیں، خود جواب دیں۔"

ولیم فریزر کے سلسلہ میں جناب امداد صابری نے اپنی تصنیف "اردو کے اخبار نویس" جلد اول میں تفصیل سے لکھا ہے جس کے مطابق فریزر کی پوری زندگی عیاشانہ اور غنڈے پنے کی تھی
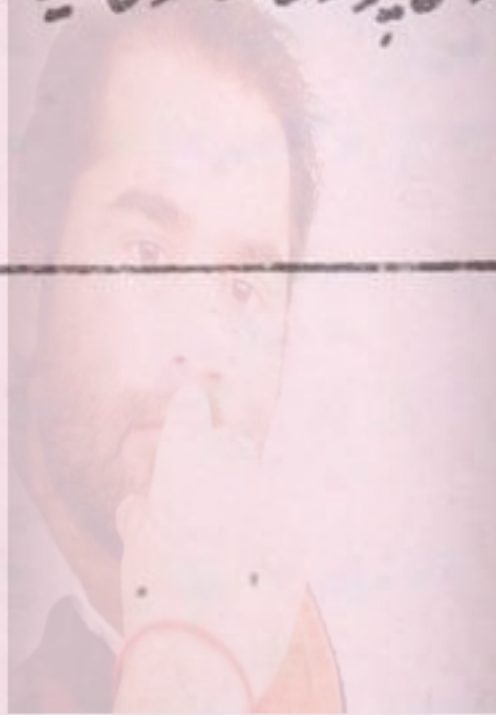
غالب کے بعد

بنگال میں ان کے چند

خاص قدرداں

مولوی کبیر الدین احمد

مولوی کبیر الدین احمد کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ لیکن وہ بنگلہ کے علاوہ انگریزی۔ عربی۔ فارسی اور اردو زبانوں میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کلکتے کے مشہور انگریزی۔ اردو اخبار "اردو گائڈ" کے مدیر و مالک تھے۔ "اردو گائڈ" کا سنہ اجراء ۱۸۵۸ء ہے اور یہ غالبؔ ۱۸۶۵ء تک نکلتا رہا ہے۔ اس کے چند شمارے ایشیاٹک سوسائیٹی آف بنگال (کلکتہ) کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ جو میری نظر سے گذر چکے ہیں۔ مولوی صاحب کو اپنے دور کے دیگر صاحب علم بزرگ خیال کرتے تھے۔ محمد احسان اللہ سوداگر، مالک و مدیر "اخبار دار السلطنۃ کلکتہ" نے ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۸۲ء کو اپنے اداریہ میں لکھا —— "ہم سے مولانا مولوی کبیر الدین احمد صاحب کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا اور ہم ان کو

اپنا بزرگ تصور کرتے ہیں۔ اور واقع میں ایسا ہی ہے کہ آپ کی ذات والاصفات بزرگ ہی ہے" ———— مولوی کبیرالدین احمد ۱۸۸۲ء میں کلکتہ کے جسٹس آف پیس منتخب ہوئے تھے۔

گارساں دتاسی نے اپنے کئی خطبات میں "اردو گائیڈ" کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اردو گائیڈ میں شائع ہونے والے چند مضامین کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ اہل ہند کو مولوی صاحب ایک قوم سمجھتے تھے اور اردو کو قومی زبان۔

کلکتے سے "اردوئے معلیٰ" کا قدیم ترین ایڈیشن شائع کرنے کا سہرا مولوی کبیرالدین احمد کے سر ہے۔ "اردوئے معلیٰ" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۹ء میں مطبع اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا اور اس کا کلکتہ ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں "اردو گائڈ پریس" سے مولوی کبیرالدین نے شائع کیا۔ "اردوئے معلیٰ" کے اس ایڈیشن کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب محمد ذاکر صاحب نے لکھا ہے[1] ———— یہ ایڈیشن موٹے کاغذ پر $\frac{22\times18}{8}$ ۲۲ سطری مسطر پر نسخ ٹائپ میں یکم مارچ ۱۸۸۳ء کو کلکتے کے مطبع اردو گائڈ میں چھپا۔ اور میری دانست میں یہ اردوئے معلیٰ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔

"اردوئے معلیٰ" کا یہ صاف ستھرا ایڈیشن اس وجہ سے تو

---

[1] ماہنامہ جامعہ دہلی - فروری و مارچ ۱۹۶۹ء بحوالہ رسالہ تحریر دہلی جلد ۲ شمارہ ۱

اہم ہے ہی کہ مرزا غالب کی وفات اور پہلے ایڈیشن کے چودہ سال بعد چھپا، مگر اپنی صاف طباعت، صحت الفاظ اور دیدہ زیبی کے اعتبار سے بھی اردوئے معلیٰ کے تمام ایڈیشنوں میں نمایاں مقام ہے:-

مولوی کبیر الدین احمد کی دیگر تصانیف میں "اردو لغت" ۱۸۷۹ء اور "اردو جنتری" ۱۸۶۹ء شامل ہیں۔

وہاب حیدر

احمد جمال پاشا نے صحیح لکھا ہے کہ "مختلف کارٹونسٹ وقتاً فوقتاً مرزا کے کارٹون بھی پیش کرتے رہے۔ مگر اس دوران ہمیں کوئی ایسا کارٹون ساز نظر نہیں آتا، جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ وہ محض غالب ہی کے کارٹونسٹ تھے، یہ شرف صرف وہاب حیدر کو حاصل ہے کہ وہ غالب کے کارٹونسٹ تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اشعار غالب کی شرح اپنے کارٹونوں میں کی ہے۔"

بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج تک وہاب حیدر کے سلسلے میں کچھ لکھا ہی نہیں گیا سوائے ان ایک دو مضامین کے جو غالب صد سالہ برسی کے موقع پر اردو کے غالب نمبروں میں شائع ہوئے ہیں۔ جمال پاشا نے بھی اس بات کی شکایت کی ہے کہ ہم زمانے کی پیداوار ہونے کے باوجود وہاب حیدر کے حالات زندگی سے ہم آگاہ نہیں ہیں۔ بہر حال جمال پاشا

کو جو کچھ معلوم تھا انہوں نے اپنے مضمون میں قلم بند کیا ہے اور مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ لکھ رہا ہوں تاکہ آئندہ اس سلسلے میں کام کرنے والوں کو میری یہ باتیں کام آئیں۔

جمال پاشا نے وہاب حیدر کو محض غالب کا کارٹونسٹ کہا ہے جو درست نہیں ہے اس لیے کہ غالب کے اشعار پر کارٹون بنانے کے علاوہ وہاب نے کئی دیگر شعرا کے اشعار پر کارٹون بنائے ہیں۔ سیاسی کارٹون بھی وہ بناتے رہیں اور چند کارٹون کہانیاں بھی انہوں نے لکھی ہیں جو مسلسل اخبارات میں چھپتے رہے ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ غالب ان کا خاص موضوع تھا۔ اور غالب کے اشعار پر کارٹون بنانے میں ان کا کوئی جواب ابتک پیدا نہیں ہوا ہے۔

میرا قیام شہر حیدرآباد میں ۱۹۵۴ء کے آخر تک رہا ہے۔ ان دنوں بھی میری ملاقات وہاب حیدر سے تھی۔ حیدرآباد میں "پولیس ایکشن" کے چند ماہ بعد کا واقعہ ہے کہ روزنامہ "اقدام" جس نے ان دنوں "ملکی تحریک" کی حمایت میں چند مضامین چھاپے تھے پر حکومت حیدرآباد نے پابندی لگا دی اور وہ اخبار بند کر دیا گیا۔ ان دنوں وہاب حیدر کا تعلق بھی اس اخبار سے تھا۔ میرا قیام ان دنوں حیدرآباد کے محلہ "ملے پلی" میں تھا۔ جہاں سے یہ اخبار بھی نکلتا رہا ہے۔ اخبار مذکور کے اس طرح اچانک بند ہو جانے کی وجہ سے اخبار میں کام کرنے والے بے روزگار ہو گئے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ کسی طرح ایک اور اخبار فوراً جاری کیا جائے۔ لیکن

اس اخبار کا دفتر کہاں ہوگا۔؟ چونکہ دفتر "اقدام" میں تو تالا لگا ہوا تھا۔
ایسے وقت وہاب حیدر اور ان کے چند دیگر صحافی ساتھی میرے ہاں آئے
اور انہوں نے مجھ سے اتنی مدد چاہی کہ میں اپنے گھر کا (جس میں ایک کرایہ دار
تھا) دیوان خانہ نئے اخبار کے دفتر کے لئے مفت اس وقت تک کے لئے دوں
جب تک کہ وہ نیا اخبار اپنے لئے کسی دفتر کا انتظام کر لینے میں کامیاب نہ
ہو جائے۔ میں نے بھی حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی بات رکھ لی۔ اور میرے
دیوان خانہ سے ایک نیا اخبار "ہمارا اقدام" جاری ہوا۔ رات بھر وہاب حیدر
کاتب حضرات اور دیگر جرنلسٹ وغیرہ میرے گھر میں رہتے اور اپنا اپنا کام کرتے
تھے۔ اتنا تو مجھے درست یاد نہیں لیکن اندازاً تین چار ماہ تک روزنامہ
"ہمارا اقدام" کا دفتر میرا ہی گھر تھا۔ اور پھر وہ اس لائق ہو گیا کہ
اپنے لئے دامن شہر میں ایک دفتر قائم کر لے۔ میں جب تک حیدر آباد میں
تھا یہ اخبار نکلتا رہا ہے۔ اس کے ابتدائی شماروں میں میرے مضامین
بھی ہیں۔ جن میں بیشتر کو خود وہاب حیدر نے ہی لکھا تھا اور صرف میرا نام
استعمال کیا گیا ہے۔

پھر میں کلکتہ چلا آیا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہاں پھر میری
ملاقات وہاب حیدر سے ہو گئی۔ وہ میرے آنے کے چند ماہ بعد یعنی ۱۹۵۵ء
میں کلکتہ چلے آئے۔ کلکتہ میں ایک عرصہ سے وہاب حیدر کے توام بھائی
مجید عبدل رہتے تھے۔ (افسوس کہ حال ہی میں اُن کا انتقال
ہو گیا ہے۔ اور اب صرف مجید عبدل کی بیوہ اور بچے اس شہر میں ہیں)

وہاب حیدر اور مجید عبدل دونوں کو ایک دوسرے کا چربہ یا ٹرو کاپی کہا جا سکتا ہے۔ ناک نقشہ، ڈیل ڈول، صورت سیرت، عادات۔ ہنسی مذاق مے نوشی۔ چال ڈھال، لب و لہجہ۔ سب میں اس قدر یکسانیت تھی کہ اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے یعنی وہاب حیدر کو مجید عبدل اور مجید عبدل کو وہاب حیدر سمجھ لیتے تھے۔ اُن دنوں مجید عبدل ر تو سرکار لین کلکتہ میں ایک کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ جہاں آکر وہاب حیدر بھی رہنے لگے۔ مجھ سے وہاب حیدر کی تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی۔ وہاب حیدر کو بہت جلد ہی روز نامہ "روزانہ ہند" میں کام مل گیا۔ غالباً ۱۹۵۵ء کے ستمبر یا اکتوبر سے ان کو اس اخبار کے دفتر میں کام ملا تھا۔ اس میں وہ انگریزی طرز پر با تصویر کارٹون والی مسلسل کہانیاں لکھتے اور سنڈے ایڈیشن میں بچوں کا صفحہ "بچوں کی دنیا" کو ایڈیٹ کرنے کا کام بھی ان ہی کا تھا۔ اس کے علاوہ وہاب حیدر کا خاص اور دلچسپ مشغلہ یعنی غالب کے کارٹون بنانا یہاں بھی رہا ہے۔ اگر ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے روز نامہ "روزانہ ہند" کلکتہ کا فائل دیکھا جائے تو اس میں وہاب حیدر کے کئی ایسے کارٹون ملیں گے جو انہوں نے اشعار غالب پر بنائے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق جون یا جولائی ۱۹۵۶ء تک وہاب حیدر کا تعلق "روزانہ ہند" سے رہا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں جب میں کلکتہ سے ایک اردو ہفتہ وار "فلم ویکلی" نکالنے لگا تب وہ میرے یہاں بھی کام کرتے رہے ہیں۔ "فلم ویکلی" میں وہ مستقل دو عنوانات۔ یعنی "جنسیات" اور "سوال و جواب" کے کالم سنبھالتے رہے ہیں۔ اس ہفتہ وار میں بھی ان کے

کئی کارٹون چھپے ہیں۔ افسوس کہ میرے یہاں بھی آج اس ہفتہ وار کے اس دور کا فائل نہیں ہے۔ میں تقریباً تین سال تک فلم ویکلی نکالتا رہا۔

۱۹۵۶ء کے آخر میں وہاب حیدر کلکتہ سے بمبئی چلے گئے جہاں وہ آخری دنوں تک روزنامہ "انقلاب" سے منسلک رہے تھے۔ وہاب حیدر بے حد شرابی تھے اور بلا کے سگریٹ نوش بھی۔ ساتھ ہی دن بھر میں وہ ۲۰ - ۲۵ بار چائے پیتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی صحت مند نہیں دیکھا ہے وہ عرصے سے دمہ کے مریض تھے۔ غذا ان کی برائے نام ہی تھی۔ کبھی ایک روٹی سے زیادہ کھاتے ہوئے کبھی میں نے ان کو نہیں پایا۔ ناشتہ میں ایک روٹی۔ دوپہر میں ایک روٹی اور رات میں ایک روٹی ـــــ اور وہ بھی کبھی پابندی سے کھاتے نہیں تھے۔ ان تمام باتوں کا صحت پر بُرا اثر ہونا لازمی تھا۔ اور ہوا بھی وہی۔ آخر کار ۷ ستمبر ۱۹۶۶ء کو بمبئی میں دم انتقال کر گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر کوئی ۵۵-۵۶ رہی ہے۔

وہاب حیدر کی واحد یادگار ان کے کارٹونوں کی کتاب "شعریہ شوشہ" ہے جو مرزا غالب کے اشعار پر ان کے چند کارٹونوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں بمبئی سے چھپی ہے۔ اس مجموعہ میں پچاس کارٹون ہیں۔ غالب کے اشعار پر کارٹون بنانے کا سلیقہ انہوں نے اپنے بھائی مجید عبدل سے کلکتہ میں اچھی طرح سیکھا ہے۔ انہوں نے خود اس سلسلے میں لکھا ـــــ "(کارٹونوں کو) فن کی حیثیت دینے کے کئی مرحلوں پر کلکتہ میں میرے توام بھائی مجید عبدل نے ہر طرح ساتھ دیا۔ ان کی فطری

بذلہ سنجی اور مصوری کی تخلیقی اپج اور پیشہ ورانہ مشق دور تک عمری رہنمائی کرتی رہی اور اس طرح خیال و خطوط کے اختلاط سے فن کا ایک نیا عکس سامنے آیا ــــــ" اس لحاظ سے کلکتہ وہ شہر ہے جہاں رہ کر وہاب حیدر حقیقی معنوں میں غالب کے کارٹونسٹ ہوئے ہیں۔

وحشتؔ کلکتوی

علامہ وحشتؔ کلکتوی نے اپنے بارے میں لکھا ہے[۱]

ــــــ" میں ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء میں شہر کلکتہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولوی شمشاد علی ہگلی بنگالہ کے رہنے والے تھے۔ اور والدہ باشندہ کلکتہ تھیں۔ دادا حکیم غالب علی متوطن دہلی تھے جنہوں نے آکر ہگلی میں سکونت اختیار کی۔ میں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ (بہرہ انگریزی) میں تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم میں مجھے شعر و سخن سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اساتذہ کا کلام کیا فارسی کیا اردو برابر زیر مطالعہ رہتا تھا۔ نظیری عرفی۔ ظہوری۔ صائبؔ۔ محتشم ہلالی اور حزیں کے کلام سے خاص طور پر لطف اندوز ہوتا تھا اور اسی طرح اردو میں میرؔ۔ غالبؔ اور مومنؔ کا کلام برابر پیش نظر رہا کیا۔ زمانہ طالب علمی میں حضرت شمسؔ

---

[۱] روزنامہ ہند کلکتہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۶ء

گلکنوی خلف الرشید حضرت نساخ سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ غالب کے کلام سے مجھے ایک عشق تھا۔ اور اُنہی کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی چنانچہ نظیری کے ایک مصرعہ کی تضمین کرتے ہوئے میں نے خود کہا۔

سخن آموخت غالب از نظیری وحشت از غالب

چراغ راکہ دودے ہست از سر زد در گرد

۱۹۱۰ء میں دیوان وحشت شائع ہوا تھا۔ جس کے متعلق مولانا حالی علامہ شبلی۔ ڈاکٹر اقبال و دیگر اکابر نے نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گذر اوقات کے لیے میں نے ملازمت بھی کی۔ پہلے گورنمنٹ آف انڈیا امپریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں میرا تقرر ہوا۔ جہاں عرصہ تک میں اس دفتر کے صیغہ فارسی میں "چیف مولوی" کا کام انجام دیتا رہا اور جب اسلامیہ کالج کلکتہ قائم ہوا تو میں اردو کا پروفیسر مقرر ہوا۔ وہاں ایک سالانہ مشاعرہ کی میں نے بنیاد ڈالی۔ جس نے بڑی شہرت حاصل کی اور توسیع اردو میں بڑا حصہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں میری خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے مجھے خان بہادر کا خطاب عطا کیا۔ پنشن ہو جانے کے بعد میں نے کوئی چار سال تک لیڈی برابورن کالج کلکتہ میں اردو اور فارسی درس دیا۔

۱۹۵۰ء میں حالات نے مجھے مشرقی پاکستان کا مہاجر بننے پر مجبور کیا اور ڈھاکہ آکر مقیم ہوا۔ لیکن زندگی کا لطف جاتا رہا۔

زمین ڈھاکہ نے کی قلب پر افسردگی طاری
ہوا خلوت نشیں میں اور شوق انجمن چھوٹا

وطن اور وہ بھی کلکتہ غضب تھا چھوٹنا اس کا
قیامت ہو گئی وحشت سے وحشت کا وطن چھوٹا

ہاں ڈھاکہ میں پہنچ کر ایک یہ کام کیا کہ وہ کلام جو "دیوان وحشت" کی اشاعت کے بعد جمع ہوا تھا۔ اس کو "ترانۂ وحشت" کے نام سے چھپوایا مکتبہ جدید لاہور اس کا ناشر ہے ——— ڈھاکہ ستمبر ۵۴ء رضا علی وحشت "

میں نے وحشت کی خود نوشت اس سوانحمری کو مکمل طور پر یہاں اس لئے پیش کیا ہے چونکہ ابتک یہ کسی کتاب میں شامل نہیں ہے اور صرف ایک اخبار میں ہونے کی وجہ سے بہت ممکن ہے مستقبل کے محققین کو اس کا تلاش کرنا مشکل ہو جائے۔

اردو کے تمام اہل علم و قلم۔ ادباء و نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ رنگ غالب کو بجا طور پر۔ کامیابی سے "اگر کسی نے اپنایا ہے تو وہ علامہ وحشت اور صرف وحشت ہی ہیں۔ اظہر قادری مصنف "رضا علی وحشت" نے کلام وحشت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے ——" غالب کے رنگ میں کہنے والوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی نے غالب کے فلسفیانہ مزاج اور حکیمانہ شعور کو سمجھا ہے تو وہ وحشت ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اس میں شک نہیں کہ وحشت اپنے تغزل کی سنجیدگی۔ معنی آفرینی اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال سے غالب اسکول کے نہایت کامیاب شاعر سمجھے جاتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جس پختگی اور دلکشی کے ساتھ انہوں نے پیش کیا وہ اور کسی کو نصیب نہیں ہو سکا۔ وحشت نے غالب کا تتبع کیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ"

سید لطیف الرحمان صاحب نے "ناسخ سے وحشت تک" میں وحشت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "تقریباً ان کی عمر ۱۵ سال کی تھی کہ ایک روز حضرت سخن دہلوی تلمیذ حضرت غالب کی کتاب "سروش سخن" کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس میں جا بجا غالب کے اشعار پیش کئے گئے تھے۔ غالب کے ان اشعار کو پڑھ کر کلام غالب کے مطالعہ کا شوق ہوا اور کلام غالب کی بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اتنے متاثر ہوئے کہ غالب کے رنگ میں شعر کہنے لگے۔"